رجسٹرڈ نمبر اے ۴۶۶

مئی ۱۹۵۱ء

لہ ۱۹ فحش

نگار

مومن نمبر کا دوسرا اڈیشن

زیر کتابت ہے

جولائی ۱۹۵۱ء تک شایع ہو جائے گا

قیمت دو روپیہ - منیجر نگار

ہندوستان و پاکستان دونوں جگہ

قیمت فی کاپی ۱۰/

سالانہ چندہ پاکستان و ہندوستان

چھ روپیے

تصانیف نیاز فتحپوری

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کے لیے ختم کردینے والی
انجیل انسانیت

من و یزداں

مولانا نیاز فتحپوری کی ۴۰ سالہ دور تصنیف و صحافت کا ایک غیر فانی کارنامہ جسمیں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کرکے تمام نوع انسانی کو "انسانیت کبریٰ و اخوت عامہ" کے ایک رشتہ سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے اور جسمیں مذاہب کی تخلیق دینی عقائد، رسالت کے مفہوم اور صحائف مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی، علمی اخلاقی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہایت بلند انشا اور پرزور خطیبانہ انداز میں بحث کیگئی ہے۔

ضخامت ۲۷۶ صفحات۔ مجلد سات روپیہ آٹھ آنے بعہ
علاوہ محصول

مذہبی استفسارات و جوابات
یعنی

من و یزداں کا دوسرا حصہ

اس حصہ میں جن مسایل پر حضرت نیاز نے روشنی ڈالی ہے انکی مختصر فہرست یہ ہے:۔ اصحاب کہف۔ معجزہ کرامت۔ انسان مجبور ہے یا مختار۔ مذہب و عقل۔ طوفان نوح۔ خضر کی حقیقت۔ مسیح علم و تاریخ کی روشنی میں۔ یونس اور دہان ماہی۔ حسن یوسف کی داستان۔ قارون۔ سامری۔ علم عبث۔ دعا و توبہ۔ لقمان۔ عالم برزخ۔ یاجوج ماجوج۔ ہاروت ماروت۔ حوض کوثر۔ امام مہدی۔ نور محمدی اور پل صراط۔ آتش نمرود وغیرہ

ضخامت ۲۲۴ صفحات۔ کاغذ سفید دبیز
قیمت علاوہ محصول پانچ روپیہ آٹھ آنے

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ۔ نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبول حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اسکے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کیے گئے۔ اس ایڈیشن میں متعدد افسانے و ادبی مقالات ایسے اضافہ کیے گئے ہیں جو پچھلے ایڈیشنوں میں نہ تھے۔ اس لیے ضخامت بھی زیادہ ہے

قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

جمالستان

اڈیٹر نگار کے افسانوں اور مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جسمیں حسن بیان۔ قدرت بیان اور پاکیزگی خیال کی بہترین شاہکاروں کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشرتی مسائل کا حل بھی نظر آئے گا۔ ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے اس ایڈیشن میں متعدد افسانے اضافہ کیے گئے ہیں جو پہلے ایڈیشنوں میں نہ تھے

قیمت پانچ روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

حسن کی عیاریاں
اور دوسرے افسانے

حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جسمیں تاریخ اور انشا لطیف کا بہترین امتزاج آپکو نظر آئیگا اور ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہوگا کہ تاریخ کے بھولے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ تھیں حضرت نیاز کی انشا نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے۔

قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

ترغیبات جنسی یا
شہوانیات مجلد

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات کی تاریخی و نفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح و بسط کے ساتھ تحقیقانہ تبصرہ کیا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس طرح رائج ہوئی نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اسکے رواج میں کتنی مدد کی اس کتاب میں آپکو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے۔ نیا ایڈیشن

قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

ضروری اعلان

پاکستان کے خریدار اور ایجنٹ صاحبان کے لئے

پاکستان کے بعض حضرات کا مطالبہ ہے کہ نگار اور مکتبۂ نگار کی کتابوں کی قیمت بھی اسی شرح تبادلہ کو سامنے رکھ کر متعین کیجائے جسے دونوں حکومتوں نے تسلیم کر لیا ہے، لیکن وہ اس حقیقت کو سامنے نہیں رکھتے کہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جو مفاہمت ہوئی ہے اس کا تعلق زیادہ تر مال کے تبادلہ سے ہے یعنی جس قیمت کا مال پاکستان سے ہندوستان آئے گا اتنی ہی قیمت کا مال ہندوستان سے پاکستان جائے گا، نقد نہ ادا کرے گا، نہ وہ — اسی طرح بعض بڑے بڑے تاجروں کے لئے بھی یہ آسانی پیدا کی گئی ہے کہ وہ بنکوں کے ذریعہ سے مال اِدھر اُدھر بھیج سکیں، لیکن عام پبلک کے لئے اس وقت تک کچھ نہیں کیا گیا — پبلک شرح تبادلہ سے اسی وقت فایدہ اُٹھا سکتی ہے جب چھوٹی سی چھوٹی رقم بھی یہاں سے وہاں، وہاں سے یہاں بھیجی جا سکے اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک منی آرڈر کی آمد و رفت شروع نہ ہو جائے — اس لئے ہم اپنے تمام کرمفرمانِ پاکستان سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اس باب میں تدریجی صبر و تحمل سے کام لیں۔ ہم قطعاً ان سے کوئی زاید رقم لینا نہیں چاہتے اور جس چیز کی جو قیمت ہمیں یہاں ملتی ہے، وہی ان سے بھی چاہتے ہیں۔ منیجر

نگار کا آیندہ سالنامہ

ایک ایسی معرکۃ الآرا تصنیف ہوگی جسکی اسوقت سب سے زیادہ ضرورت ہے،

یعنی

اُردو زبان کی لسانی تاریخ

(پروفیسر شوکت سبزواری کے قلم سے)

جس میں اُردو زبان کے ماخذ کا کھوج کیا گیا ہے اور اس کے تمام صوتی، صرفی، نحوی سرمایہ کی مفصل و جامع تاریخ پیش کی گئی ہے۔ یہ کتاب نتیجہ ہے سالہا سال کے غایر مطالعہ کا اور علاوہ طلبہ کے ہر اس شخص کے لئے بھی جو اُردو زبان سے دلچسپی رکھتا ہے اس کا مطالعہ از بس ضروری ہے — یہ کتاب نگار کے سایز پر نہیں بلکہ کتابی سایز پر شایع ہوگی اور تقریباً ۳۵۰ صفحات کو محیط ہوگی۔ اس کی قیمت **چار روپیہ** ہوگی، لیکن نگار کے مستقل خریداروں کو صرف **ڈیڑھ** روپیہ میں مل سکے گی۔

اس لئے وہ حضرات جن کا چندہ دسمبر ۱۹۵۱ء میں ختم ہو رہا ہے ابھی سے نوٹ کر لیں کہ ان کے نام سالانہ وی پی سات روپیہ تیرہ آنے میں بھیجا جائے گا۔ جن کا چندہ ۱۹۵۲ء کے کسی مہینے میں ختم ہوتا ہے ان کے نام سالنامہ کا وی پی ایک روپیہ تیرہ آنہ میں روانہ ہوگا۔

پیشگی چندہ بھیجنے والے پانچ آنے زاید مصارف رجسٹری کے لئے ضرور روانہ فرمائیں۔ منیجر نگار

دنیا میں اپنی نوعیت کی سب سے پہلی کتاب

پچپن ۵۵ سال کے بعد

یہ کتاب آئندہ جولائی ۱۹۵۱ء کے نگار میں تمام و کمال کتابی سائز پر شائع ہو رہی ہے "نفسیات عملی" کے حیرت ناک نتائج پر یہ بالکل پہلی کتاب ہے۔ ادب و انشا کے لحاظ سے بھی اپنا جواب نہیں رکھتی۔ دلچسپ اتنی ہے کہ آپ اس میں کھو جائیں۔ مفید اسقدر کہ آپ اپنے آپ کو حقیقی معنی میں پالیں۔ مفصل اشتہار آئندہ اشاعت میں ملاحظہ ہو۔

غیر خریداران نگار کے لیے قیمت دو روپیہ — پیشگی نگار

جلد ۵۹ | فہرست مضامین مئی ۱۹۵۱ء | شمار ۵

ملاحظات ---------- ۲
آتش اور شاد --- عطاء الرحمٰن عطا کاکوی ---- ۵
سرقہ، توارد، استفادہ --- عزیز حسن ---- ۱۴
تاریخ یونان کا ایک پوشیدہ ورق ---------- ۲۲
قوت متخیلہ اور روحانی تصورات -- جلیل احمد ام۔اے -- ۲۵
آمیرو اور آنسخ کا تقابلی مطالعہ -- (پروفیسر) عطاء الرحمٰن --- ۲۸
باب الاستفسار ---------- ۳۶
ادبیات ملایا پر فارسی کا اثر ---------- ۳۸
غیر متوقعات ---------- ۳۹
مختصرات ---------- ۴۱
مئی کی ایک دوپہر (نظم) --- افسر سیمابی ---- ۴۳
صبح نشور (نظم) --- فنا ابن فیضی ------ ۴۵
غزلیات -- شفا گوالیاری - انجم رضوانی ---- ۴۶
اشتہارات ---------- ۴۷ - ۴۸

ملاحظات

کوریا کی جنگ عالمگیر جنگ کی تمہید ہے

جب سے کوریا کی لڑائی شروع ہوئی ہے، سب سے زیادہ اہم واقعہ جس نے ساری دنیا کو حیرت میں ڈال دیا، جنرل میک آرتھر کی معزولی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زمانہ سانس لینے کے لئے شاید کچھ دیر کو ٹھہر گیا ہے اور ہو سکتا ہے کہ آیندہ اس کے انتہاب و اشتعال میں کچھ کمی ہو جائے، لیکن وقت کے نبض شناس جانتے ہیں کہ اس وقفۂ سکون کی کیا حقیقت ہے اور جنگ کے بحران میں اس سے کسی کمی کی توقع رکھنا عبث ہے۔

اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے ایک مریض شدید تپ میں مبتلا ہو اور کسی وقت جب اس کا بخار کم ہو جائے تو اسکے تیمار دار یہ سمجھ کر خوش ہو جائیں کہ اب بیمار اچھا ہو چلا ہے، حالانکہ طبیب جانتا ہے کہ تپ اس وقت تک دور نہیں ہو سکتی جب تک اس کا حقیقی سبب زایل نہ ہو۔

بالکل یہی حال کوریا کی لڑائی کا ہے کہ اس کا تعلق: جنرل میک آرتھر کی ذات سے ہے، نہ ٹرومین کی شخصیت سے، بلکہ اُس عالمِ خوف و جنون سے ہے، جو اشتراکیت کے اندیشہ سے اس وقت تمام سرمایہ پرست حکومتوں پر طاری ہے اور جس کے دور ہونے کی بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

کوریا میں امریکہ کا اپنی فوجیں اُتارنا، میک آرتھر سے گفتگو کرنے کے لئے ٹرومین کا امریکہ سے ایشیا آنا، اور میک آرتھر کا معزول کر دیا

جانا، سب کی سب مذبوحی حرکات تھیں، جو بالکل بے اختیارانہ طور پر سرزد ہوئیں اور جن سے بجائے صحت و سکون کے یہ اندیشہ پیدا ہوتا ہے کہ کہیں عالم احتضار تو قریب نہیں آگیا ؟

امریکہ اور اس کے تمام حواریین کہتے تو یہی ہیں کہ وہ دنیا میں امن و سکون قایم کرنے کے لئے یہ سب کچھ کر رہے ہیں، لیکن دل کی جو بات ہے وہ زبان پر نہیں لاتے اور اس قارون کا ذکر نہیں کرتے جو ان کے دل و دماغ پر چھایا ہوا ہے اور جس نے جملہ انسانی و اخلاقی احساسات کو محو کر دیا ہے۔

ان کو سب سے بڑی شکایت یہ ہے کہ روس کے پاس ۲۰۰ ڈویژن فوج کیوں موجود ہے، وہ کیوں اپنی بحری قوت کو نہایت تیزی سے بڑھاتا جا رہا ہے، اس کے ہوائی جہازوں کی تعداد کیوں روز بروز زیادہ ہوتی جا رہی ہے، آٹم بم اس نے کیوں طیار کر لیا، مختلف قسم کی مہلک گیسیں اس نے کیوں دریافت کر لیں، اس کے پاس ذخایر حرب کی کمی کیوں نہیں، اس نے یہ اندیشہ کیوں پیدا کر دیا ہے کہ معلوم نہیں وہ کس وقت مغربی یورپ پر حملہ کر دے، اور بحر الکاہل پر چھا جائے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر یہ سب کچھ صحیح ہے تو کیا یہ اشتراکی نظام کی برتری کا ثبوت نہیں ہے اور اگر آہستہ آہستہ یہی نظام دنیا میں پھیلتا جا رہا ہے، تو امریکہ کو اس سے کیوں تکلیف پہونچتی ہے اور وہ کیوں اس کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس وقت دنیا کی سب سے بڑی سرمایہ دار حکومت امریکہ کی ہے اور وہ اپنا اقتدار قایم رکھنے کے لئے وسعت اشتراکیت کے بعید ترین امکانات کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتی۔ ہر چند اس کے حدود حکومت روس کے حدود سے بہت دور ہیں، لیکن اس اندیشہ سے کہ جس طرح وہ وسطی یورپ میں پھیلا ہے اسی طرح وہ مغربی یورپ میں بھی پھیل سکتا ہے اور مغربی یورپ کا اشتراکی ہو جانا امریکہ کی موت ہے، وہ مارشل پلان اور اٹلانٹک پیکٹ کے ذریعہ سے روس کے خلاف محاذ طیار کر رہا ہے۔

اس کا مقصود مغربی یورپ کی حکومتوں کی مدد کرنا ظاہر کیا جاتا ہے، حالانکہ امریکہ کا اصل مدعا یہ ہے کہ اشتراکیت پر ان حکومتوں کی بھینٹ چڑھا کر خود زیادہ سے زیادہ محفوظ رہ سکے۔

ان مغربی حکومتوں میں سب سے زیادہ اہم برطانیہ ہے اور گو اس وقت وہ امریکہ کے اشارہ پر چل رہا ہے، لیکن اسی کے ساتھ وہ یہ بھی سمجھتا ہے کہ اگر روس کو جنگ کے لئے مجبور کر دیا گیا تو سب سے پہلے اسی کو اشتراکی بموں کا نشانہ بننا ہے اور اسی اندیشہ سے وہ چین کی اشتراکی حکومت کو تسلیم کر کے سکوریٹی کونسل میں اس کے شامل کئے جانے پر مصر ہے، جسے امریکہ نے ابتک تسلیم نہیں کیا۔

برطانیہ و امریکہ کی پالیسی میں یہ اختلاف بظاہر بہت غیر اہم نظر آتا ہے، لیکن حقیقتاً اس کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور یہ اختلاف ٹرومین اور میک آرتھر دونوں کے لئے کافی دردِ سر بنا ہوا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ جو بات میک آرتھر نے علی الاعلان کہی ہے وہی ٹرومین کے دل میں بھی ہے، اور دونوں یہی چاہتے ہیں کہ نہ صرف شمالی کوریا، بلکہ فارموسا، منچوریا اور ممکن ہو تو خود چین کے بعض علاقوں پر بھی قبضہ کر لیا جائے، لیکن ان دونوں کی تدابیر میں فرق ہے۔ میک آرتھر یہ سمجھتا ہے کہ روس ابھی تک جنگ کا خطرہ مول لینے کے لئے طیار نہیں اس لئے اشتراکی چین کو ختم کر دینے کا وقت یہی ہے، ٹرومین، روس کی طرف سے اتنا مطمئن نہیں ہے اور اس کا خیال ہے کہ جب تک جاپان اور مغربی جرمنی کو پوری طرح مسلح نہ کر لیا جائے، روس کو جنگ کی دعوت دینا بڑے خطرہ کی بات ہے۔ اس لئے سوال لڑائی کے ختم کر دینے کا نہیں بلکہ اسکو پوری کامیابی کے ساتھ جاری رکھنے کا ہے اور اسی حقیقت کو سامنے رکھ کر، برطانیہ اور دوسری بڑی بڑی سلطنتیں، طیاریاں کر رہی ہیں اور دنیا کی تمام صنعت گاہیں، پھر اسلحہ جنگ اور ذخایر حرب کی طیاری و فراہمی میں مصروف نظر آتی ہیں۔

بہر حال یہ خیال کرنا کہ کوریا کی لڑائی جلد ختم ہو جائے گی یا یہ کہ وہ صرف کوریا تک محدود رہے گی بالکل غلط ہے کیونکہ نہ امریکہ جنگ سے دست کش ہو کر اپنے اقتدار کو صدمہ پہونچا سکتا ہے اور نہ چین یہ گوارا کر سکتا ہے کہ اسکے ملک پر کسی سرمایہ دار حکومت کا اقتدار قایم ہو۔

امریکہ کو سب سے زیادہ اعتماد ایٹم بم پر ہے اور سمجھتا ہے کہ ہیروشیما کی یاد تازہ کرکے وہ جاپان کی طرح چین کو بھی مفتوح و مغلوب کرسکتا ہے، لیکن اس کو سمجھنا چاہئے کہ پچھلے دس سال کے زمانہ میں دوسری قومیں بھی بیکار نہیں بیٹھی رہی ہیں اور اگر چین امریکہ کے مقابلہ میں آئے گا تو یہ سمجھ کر آئے گا کہ اسے جوہری بم کی تباہکاریوں کا مقابلہ کرنا ہے۔

بہرحال جنرل میک آرتھر کی معزولی کا سبب یہ قرار دینا کہ کوریا کے باب میں امریکہ کی پالیسی بدل جائے گی، قطعاً غلط ہے، بلکہ اس میں اور زیادہ پیچیدگی پیدا ہوجانے کا اندیشہ ہے، کیونکہ جنرل میک آرتھر کے امریکہ پہونچ جانے سے ریپبلکن پارٹی کو اور زیادہ تقویت پہونچ جائے گی اور ہوسکتا ہے کہ ٹرومین کو اپنی اور اپنی ڈیماکریٹک پارٹی کی ساکھ قایم رکھنے کے لئے، میک آرتھر کے ہاتھ میں دوبارہ جنگ کوریا کی کمان دینا پڑے۔

تازہ خبروں سے پتہ چلتا ہے کہ کوریا کی اشتراکی فوجوں نے، لاکھ کی سپاہ سے پھر حملہ شروع کردیا ہے اور اتحادی فوجوں کو پیچھے ہٹنا پڑ رہا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ دباؤ زیادہ بڑھکر اتحادی افواج کو پھر اسی خط دفاع تک پہونچادے جہاں سے ان کا جارحانہ اقدام شروع ہوا تھا، لیکن اشتراکی فوجوں کی یہ کامیابی بھی کوئی فیصلہ کن چیز ثابت نہ ہوگی۔ اس سے قبل یہ مرد جزر کئی بار دیکھا جاچکا ہے اور آیندہ بھی یہی سلسلہ برابر جاری رہے گا تا آنکہ امریکہ کی پالیسی نہ بدلے اور اتحادی افواج کوریا سے واپس نہ آجائیں یا یہ کہ چین کی اشتراکی فوجوں کی قوت بالکل نہ ٹوٹ جائے اور یہ دونوں باتیں بظاہر ناممکن العمل نظر آتی ہیں۔

اسوقت تک جنگ صرف شمالی و جنوبی کوریا کی جنگ سمجھی جاتی ہے جس میں نہ اتحادیوں کی طرف سے چین کو الٹی میٹم دیا گیا ہے اور نہ چین نے اپنی شرکت کا اعلان کیا ہے، لیکن اس میں کلام نہیں کہ شمالی کوریا کی فوج بڑی حد تک چینی رضاکاروں پر مشتمل ہے اور اسلحہ وغیرہ کی مدد بھی چین اور روس کی طرف سے پہونچ رہی ہے، اس لئے اس جنگ کا پس منظر بہت بھیانک ہے اور اتحادی افواج یا ٹرومین کی ذرا سی غلطی سے یہ تیسری عالمگیر جنگ کی صورت اختیار کرسکتی ہے۔

چینی حکومت کا ایک مطالبہ تو یہ ہے کہ اسے مجلس اقوام میں جگہ دیجائے، جس کی موافقت ہندوستان و برطانیہ نے بھی کی ہے، دوسرا مطالبہ یہ ہے کہ جزیرۂ فارموسا جو دراصل چین ہی کی ملکیت ہے خالی کردیا جائے اور تیسرے یہ کہ اتحادی افواج کوریا سے ہٹالیجائیں لیکن امریکہ ان تینوں میں سے کوئی بات ماننے کے لئے طیار نہیں اور اس ضد کا نتیجہ ایک ہی ہوسکتا ہے اور وہ یہ کہ چین بھی میدان میں آجائے اور اس کے ساتھ روس بھی۔

بہرحال اس جنگ کے وسیع ہوجانے کے تمام امکانات قوی ہوتے جارہے ہیں اور بظاہر کوئی صورت مفاہمت کی ایسی نظر نہیں آتی جو اس خطرہ کو دور کردینے والی ہو۔

دستور میں تبدیلی

اس میں شک نہیں ہندوستان کی موجودہ حکومت بڑے صبر آزما دور سے گزر رہی ہے اور اس وقت تک اپنے مخالف جماعتوں کی جرح و تنقید کو جس ضبط و تحمل کے ساتھ سنا ہے، وہ یقیناً مستحق تعریف ہے۔ لیکن اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ دستور کی بعض دفعات میں ترمیم کرکے اپنی اس بلند خصوصیت کو ہاتھ سے دیدینا چاہتی ہے۔

کسی قوم و ملک کا دستور ایسی بنیادی چیز ہے کہ اگر اس کی طرف سے لوگوں کا اعتماد و یقین اٹھ جائے تو حکومت کے وجود کا متزلزل ہوجانا بھی یقینی ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر جیکار نے جو ہندوستان کے بہت بڑے مقنن و قانون ساز سمجھے جاتے ہیں، حال ہی میں ایک کانفرنس کی صدارت کرتے ہوئے ظاہر کیا ہے کہ اگر حکومت نے بہ سلسلۂ ترمیم ان اصولی حقوق کو ہاتھ لگایا جو دستور نے ملک کے باشندوں کو عطا کئے ہیں تو اسکی سخت مخالفت کی جائے گی اور اس سے ملک کے امن و سکون کو سخت صدمہ پہونچے گا۔ دستور کی حیثیت ایک پودے کی سی ہے جس کو زمین پر اپنی جگہ پکڑنے کے لئے کچھ زمانہ درکار ہوتا ہے، اور جس طرح ایک پودے کو نصب کرنے کے بعد گھڑی گھڑی اکھاڑ کر یہ دیکھنا کہ اسکی جڑیں پھیلی ہیں یا نہیں، غلط طریقہ ہے، اسی طرح دستور میں ترمیم و تبدیلی بھی اسکو مستحکم ہونے سے روکتی ہے۔ دستور بچوں کا گھروندا نہیں کہ آج بنایا کل توڑ دیا، وہ بنیاد ہے تعمیر حکومت کی اور بنیاد کو چھونا پوری عمارت کو متزلزل کردینا ہے۔

آتش اور شاد

(بہ سلسلۂ ماسبق)

آتش اور شاد کی یکرنگی اور ہم آہنگی کا پتہ اس وقت زیادہ چلتا ہے جب دونوں کی ہم طرحی غزلیں ساتھ ساتھ پڑھی جائیں۔ شاد نے آتش کی طرحوں میں بہت سی غزلیں لکھی ہیں، دونوں کے دواوین سے چند غزلیں ناظرین کے سامنے پیش کرنے کی جرأت کرتا ہوں۔ مجھے ایسا کرنا اس لئے ناگزیر تھا کہ بغیر اس کے دونوں شعراء کی غزل گوئی کا فرق، ان کے اسلوب بیان اور انداز طبیعت کا رنگ ظاہر نہ ہوتا۔ میں نے چاہا ہے کہ آتش اور شاد کے متعلق کافی مواد اس مضمون میں جمع کر دوں تاکہ آیندہ کوئی صاحب اس پر مزید روشنی ڈالنا چاہیں تو ان کے لئے سہولت ہو۔ ہم طرحی غزلوں کے موازنہ کے بعد میں نے متحد الخیال مضامین کے اشعار کا موازنہ پیش کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ ایک ہی مضمون کو دونوں نے کس کس طریقہ سے لکھا ہے۔ میں نے جا بجا اپنی رائے کا بھی اظہار کر دیا ہے، ہو سکتا ہے کہ اپنی اپنی پسند کا اختلاف ہو۔ پھر خوف طوالت کے خیال سے ایک ہی مضمون کے تحت دونوں کے ہم خیال اشعار لکھ دئے گئے ہیں اور آگے چل کر مزید اختصار کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک طرف آتش کے اشعار اور دوسری طرف شاد کے اشعار نقل کر دئے ہیں، آپ خود پڑھ کر فیصلہ کریں کہ کون لایق ترجیح ہے۔ انداز بیان اور اسلوب ادا کا فرق ہو تو ہو مگر اجمالی طور پر میں یہ کہنے میں تامل نہیں کرتا کہ شاد کو آتش پر ترجیح ہے۔ ظاہری اور معنوی دونوں حیثیت سے شاد کو آتش پر فوقیت حاصل ہے، اور غالب کے بعد شاد جیسا کوئی زبردست غزل گو پیدا نہیں ہوا۔ میں آتش کا پرستار ہوں، ان کے کلام کی تڑپ، تیور، اور تیکھاپن پر جان دیتا ہوں، ان کے طنز کے طرز کو سراہتا ہوں، مگر ایمان کی بات یہ ہے کہ شاد کے یہاں کی بلند آہنگی، علوئے تخئیل، پاکبازانہ انداز بیان کا جواب نہیں ہو سکتا۔

آتش

وہ نازنیں یہ نزاکت میں کچھ یگانہ ہوا
جو پہنی پھولوں کی بدھی تو درد شانہ ہوا

شب اس کے افعیٔ گیسو کا جو فسانہ ہوا
ہوا کچھ ایسی بندھی لگ چراغ خانہ ہوا

نہ پوچھ حال مرا چوب خشک صحرا ہوں
لگا کے آگ مجھے کارواں روانہ ہوا

اثر کیا تپش دل نے آخر اس کو بھی
رقیب سے بھی مرا ذکر غائبانہ ہوا

گناہگار ہیں محراب تیغ کے ساجد
جھکایا سر تو ادا فرض پنجگانہ ہوا

شاد

زہے شرف ترے در پر بسر زمانہ ہوا
خوشا نصیب کہ میں خاک آستانہ ہوا

سیاہ بختوں کا آغاز جب فسانہ ہوا
خموش اول شب سے چراغ خانہ ہوا

خدا برا کرے اس نیند کا یہ کیسی نیند
کھلی کب آنکھ کہ جب کارواں روانہ ہوا

چھپی نہیں ہے کوئی شے نگاہ والوں سے
وہ بے بصر ہے جسے عشق غائبانہ ہوا

تمام رات جو گزری تھی مے پرستی میں
خلوص دل سے ادا صبح کا یگانہ ہوا

آتش

بھرا ہے سینۂ دل کوئے محبت سے
خدا کا گھر تھا جہاں واں شراب خانہ ہوا
ہمیشہ شام سے ہمسائے مر رہے آتش
ہمارا نالۂ دل گوش کو فسانہ ہوا
پامال کیجئے انھیں رفتار ناز کا،
طاؤس و کبک رکھتے ہیں دعویٰ نیاز کا
ہو جائے حسن معنی بے صورت آشکار
روئے حقیقت الٹے جو پردہ مجاز کا
عمر خضر سے اس کی زیادہ ہو زندگی
دھووں پئے جو یار کی زلفِ دراز کا
ساقی زلال و درد جو توفیق ہو سو دے
مستوں کو تیرے ہوش کہاں امتیاز کا
ہر جمعہ کو ظہور کا رہتا ہوں منتظر
مشتاق ہوں امام کے پیچھے نماز کا
اللہ رے صفائے بیان حدیث دوست
دم بند ہے فصاحت اہلِ حجاز کا
نیرنگ حسن و عشق کی اللہ رے بہار
بے کار کوئی فعل نہیں کارساز کا
کیونکر وہ نازنیں نہ کرے بے نیازیاں
انداز سے بھی حوصلہ عالی ہے ناز کا
پتلوں سے خاک کے یہ گڑھے بھر چکیں کہیں
دھبہ مٹے زمیں کے نشیب و فراز کا
آتش جگہ نہ دل میں ہوا و ہوس کو دو
کم زہر سے اثر نہیں اس شہر آز کا
تار تار پیرہن میں بس گئی ہے بوئے دوست
مثل تصویر نہالی میں ہوں یا پہلوئے دوست
چہرۂ رنگیں کوئی دیوان رنگیں ہے مگر
حسن مطلع ہیں مسیں مطلع ہے صاف ابروئے دوست
یاد کر کے اپنی بربادی کو رو دیتے ہیں ہم
جب اڑاتی ہے ہوائے تند خاک کوئے دوست

شاد

غضب کیا ترے جانے نے بزم میں ساقی
بلند چار طرف شور عامیانہ ہوا
بہت ضعیف ہوا اے شاد رہ نہ جاؤ کہیں
بڑھاؤ تم بھی قدم کارواں روانہ ہوا
جانے بھی دے محل نہیں یہ کبر و ناز کا
آخر ہے رات وقت ہے راز و نیاز کا
ان کی نگاہ ناز جو پلٹی تو دیکھنا
منہ دیکھتی رہے گی حقیقت مجاز کا
جکڑے ہوئے ہیں دونوں جہاں قیدیوں کی طرح
اللہ رے سلسلہ تری زلفِ دراز کا
دیکھا تو ہوگا ہم نے ازل میں ترا جمال
لیکن وہ کوئی وقت نہ تھا امتیاز کا
اے رند قصد سجدۂ خم کا رہے ضرور
داخل نماز میں ہے تہیہ نماز کا
اللہ رے بلندیِ بام ثنائے دوست
ہے پست حوصلہ قلمِ سرفراز کا
صانع کو دیکھنا ہو تو عالم پہ کر نگاہ
آئینہ آئینہ ہے خود آئینہ ساز کا
کس طرح دل پہ فتنۂ محشر کا ہو اثر
ہنگامہ یاد ہے تری رفتار ناز کا
عالم کو خود پسند ہیں نیرنگ سازیاں
اس میں قصور کیا نگہ فتنہ ساز کا
شاید صفِ نعال میں تھوڑی سی جا ملے
اے شاد ہم بھی رکھتے ہیں دعویٰ نیاز کا
محو ہیں اپنی جگہ آسودگانِ کوئے دوست
آرزو دل میں ہے دل آنکھوں میں آنکھیں سوئے دوست
زندگی تا چند محراب دعا میں کاٹئے
کاش اک دن ذبح کر چھوڑے خم ابروئے دوست
لاشۂ عریاں عاشق کا کوئی دیکھے وقار
ڈھانکتی ہے اٹھ کے کس الفت سے خاکِ کوئے دوست

داغ دل پر خیر گذری تو غنیمت جانیے
دشمنِ جاں ہیں جو آنکھیں دیکھتی ہیں سوئے دوست

دو مریں گے زخم کاری سے تو حسرت سے ہزار
چار تلواروں میں شامل ہو جائیگا بازوئے دوست

فرش گل بستر تھا اپنا خاک پر سوتے ہیں اب
خشت زیر سر نہیں یا تکیہ تھا زانوئے دوست

ہجر کی شب ہو گئی روزِ قیامت سے دراز
دوش سے نیچے نہیں اترے ابھی گیسوئے دوست

دور کر دل کی کدورت محو ہو دیدار کا
آئینہ کو سینہ صافی نے دکھایا روئے دوست

اس بلائے جاں سے آتش دیکھئے کیونکر بنے
دل سوا شیشے سے نازک دل سے نازک خوئے دوست

دیکھ لیں ہے جو قیامت کا تماشا باقی
ہو چکے وہ بھی جو ہو صحبتِ فردا باقی

فرقت یار میں مردہ سا پڑا رہتا ہوں
روح قالب میں نہیں جسم ہے تنہا باقی

اس قدر سینۂ غم عشق سے معمور رہا
نہ رہی دل میں مرے حسرت دنیا باقی

گرمیاں ہیں جو یہی آہ شرر افشاں کی
نہیں رہنے کا مرے یار کے پردا باقی

محفل آباد ہے منہ پر سے نقاب الٹو تو
دیکھ لیگا کوئی ہووے گا جو بینا باقی

چھیڑ بیٹھے جو ہم افسانۂ گیسوئے دراز
صبح ہوگی نہ رہے گی شب یلدا باقی

جان پر بن گئی دم گننے لگا میں شبِ ہجر
گنتے گنتے نہ رہا جب کوئی تارا باقی

کون وارفتہ ترے گیسوئے پیچاں کا نہیں
کس کو سودا نہیں یہ سلسلہ ہے تا باقی

یہی آتش کی دعا ہے یہی آتش کی دعا
مغفرت ہووے مری بعد فنا یا "باقی"

تو بڑا عاقل ہے ناصح تو ہی سمجھا دے مجھے
کون شے رہ رہ کے دل کو کھینچتی ہے سوئے دوست

خط گلے پر پڑ چکا تھا خون دیتی تھیں رگیں
وائے حسرت کس جگہ آکر تھکا بازوئے دوست

کس خوشی سے تہنیت دیدے کے یوں کہتا ہو دل
وصل کی شب ہے مبارک دوست کو پہلوئے دوست

دہر میں کیا کیا ہوئے ہیں انقلابات عظیم
آسماں بدلا زمیں بدلی نہ بدلی خوئے دوست

نکلے آتے ہیں زمیں سے پھول کس کس رنگ کے
شعبدے دکھلا رہی ہے نرگسِ جادوئے دوست

شاد اہل شک یوں ہی شک میں پڑے رہجائینگے
ہم ان ہی آنکھوں سے اک دن دیکھ لینگے روئے دوست

سیر کر سیر جو ہے دیدۂ بینا باقی
جب تک آنکھیں ہیں جبھی تک ہے تماشا باقی

میکدہ میں نہ وہ ساغر ہے نہ خم ہے نہ وہ جام
چل بسے یار رہے ہم تنِ تنہا باقی

کاش جیتے یونہیں مر مر کے کئی بار اے دل
سیکڑوں سال رہے گی ابھی دنیا باقی

چار دیوار عناصر کو گرایا بھی تو کیا
وہی دھوکا ہے وہی ہے ابھی پردا باقی

جلوۂ یار ابھی تک وہی عالم ہے ترا
شجر طور ہی باقی ہے نہ موسیٰ باقی

نہ سہی چار گرہ کا جو گریباں نہ سہی
مدار عشق کہ ہے دامنِ صحرا باقی

نت نئے کھیل زمانے کو نظر آئیں گے
جب تک اس خاک پہ ہے خاک کا پتلا باقی

مجھ سے مایوس ہزاروں ہی تصدق تجھ پر
تو سلامت رہے تجھ سے ہے تمنا باقی

ہاتھ اٹھا کر جو وہ دے اسکو غنیمت سمجھو
شاد ساقی یہ تمہارا نہیں آتا باقی

اک حال پر کبھی نہیں اس کو قیام ہے
دُنیا کا کارخانہ طلسمی مقام ہے
عاشق نواز حُسن کی تعریف کیا کروں
یوسف سے بھی عزیز اُسے اپنا غلام ہے
سودائی زلف یار کا جب سے ہوا ہے دل
قالب میں مرغ روح کو ایذائے دام ہے
جب تک کرے حلال نہ مجھ بے گناہ کو
قاتل کو دہنے ہاتھ کا کھانا حرام ہے
معشوق ہی نہیں جو نہ وعدہ خلاف ہو
چاہے جو تجھ سے پختگیٔ عہد خام ہے
ہم چشم تر کو سامنے کرتے ہیں ابر کے
تم ہنس پڑو تو برق کا قصہ تمام ہے
دولت کے سامنے نہیں کچھ قدر حُسن بھی
محمود کا ایاز سا خوشرو غلام ہے
صبح بہار ہے مجھے ساقی پلا شراب
سب جانتے ہیں عید کا روزہ حرام ہے
مطلب ہے دفتر گل و لالہ میں مختصر
دو دل کی سیر میں یہ گلستاں تمام ہے
آتش بُرا نہ مانیو حق حق جو پوچھئے
شاعر ہیں ہم دروغ ہمارا کلام ہے

اے چشم رات دن تجھے رونے سے کام ہے
ملتے ہیں دونوں وقت ذرا تھم کر شام ہے
مستوں پہ منحصر ہے نہ اہل شعور پر
ساقی ترا تمام زمانہ غلام ہے
اُڑ کر چمن سے جا نہیں سکتی کہیں غریب
بلبل ازل کے دن سے گرفتار دام ہے
اتنا بھی میکشوں کو نہیں میکشی میں ہوش
حد سے اگر سوا ہو تو پینا حرام ہے
تیغ نگاہ یار تری کاٹ الاماں
فولاد بھی تو آگے ترے موم خام ہے
دو چار نالے اور کرو صبح ہو چلی
ہاں عاشقو بس اب شب فرقت تمام ہے
کہتے ہیں کس کو حُسن کی خدمت گزاریاں
جس مبتلا کو دیکھئے دل کا غلام ہے
اک جام کی بساط تو ساقی بہت نہ تھی
پانی بھی اب مجھے ترے گھر کا حرام ہے
ہر مست اپنے حال سے بے حال ہو گیا
ہم کیا کہ اب یہ بزم بھی ساقی تمام ہے
مہماں سرائے تن سے چلی روح کہہ کے آہ
اس گھر میں اب نہ آئیں گے گر شاد نام ہے

میں نے التزام کیا ہے کہ حتی الوسع دونوں کے یہاں قافیہ کی پابندی کے ساتھ موازنہ کیا جائے مگر اکثر و بیشتر شاد نے آتش کے قافیہ کو ہاتھ نہیں لگایا اس لئے مجبوراً مقابلہ میں دوسرے قافیہ کا شعر لکھ دینا پڑا۔ بہرحال انداز بیان اور اسلوب ادا کا پتہ چل جاتا ہے۔ مجموعی طور پر آپ اس نتیجہ پر بھی ضرور پہونچیں گے کہ موازنہ میں شاد کا پلہ اکثر بھاری ہے۔ شاد کے یہاں مضامین کی رفعت، انداز بیان کا دبدبہ، الفاظ کا ستھراپن آتش سے زیادہ ہے۔ اب آتش اور شاد کے متحد الخیال اشعار کو لیجئے:۔

عدم احسان پذیری :۔

آتش : دست یارانِ وطن سے نہیں مٹی درکار — دب مروں گا میں کہیں ریگ بیاباں کے تلے
شاد : لب تشنہ رہنا احسان سے بہتر — دیکھا کیا منہ دریا ہمارا
خوش ہیں گو تشنہ لبی نے یونہی مارا ہم کو[1] — چین ابرو نہیں دریا کی گوارا ہم کو

---

[1] غالب کہتا ہے :۔
تشنہ لب بر ساحل دریا ز غیرت جاں دہم — گر گماں افتد کہ موجش چین پیشانی مرا، "ع"

صفائے باطن - آتش : ہمیشہ جھاڑتے ہیں گرد پیرہن غافل
شاد : شستگی زباں عبث دل میں بھرے ہیں خار و خس

موت میں راحت - آتش : آسماں مر کے تو راحت ہو کہیں تھوڑی سی
شاد : آرام سے ہوں قبر کے اندر جو بند ہوں

ماعرفناک حق معرفتک - آتش : معرفت میں تیری ذات پاک کے
شاد : ترے کمال کی حد کب کوئی بشر سمجھا

عشق نے نکما کر دیا - آتش : دونوں جہاں کے کام کا رکھا نہ عشق نے
شاد : فلک کا ذکر تو کیا ہے زمیں کے بھی نہ رہے

شوق دیدار - آتش : بینا ہوں جو آنکھیں تو رخِ یار کو دیکھیں
شاد : یہ آرزو ہے تری جلوہ گاہ میں جا کر

خدا جانے قیامت کب ہو؟ - آتش : حشر پر وعدۂ دیدار نہ کر عاشق سے
شاد : تکیہ وعدہ پہ ہے سب چپکے پڑے ہیں تہ خاک

جمال یار کی تابانی - آتش : ٹھیرا حضور یار نہ ماہِ چہار دہ
شاد : شب وصل اپنی ہی آنکھوں سے یہ اندھیر دیکھا ہے

دل کا مول - آتش : مول اک نگاہ ہے جو ہو دل یار کی پسند
شاد : حاضر ہے گر پسند ہے کیا دل کا مول ہے

پیغام موت مبارک ہے - آتش : ہوتی ہے تن میں روح پیام اجل سے شاد
شاد : سعوبت سہہ چکے اے شاد ثواب چین سے کاٹو

شاعری صناعی ہے - آتش : بندش الفاظ جڑنے سے نگیں کے کم نہیں
شاد : دُر مضموں کوئی یوں باندھے اے شاد مشکل ہے

مضامین تازہ کی تلاش - آتش : رہتی ہے فکر تازہ مضامیں کی منتظر
شاد : قلم اپنا مضامین کہن منسوخ کرتا ہے

چشم یار کی نیرنگ سازی - آتش : لاتی ہے ہر نگہ میں نیا چشم یار رنگ
شاد : پوچھو نہ حال چشمِ دل آویز یار کا،

مقام روح - آتش : قالب خاکی کو تو سنتے ہیں آتش زیر خاک
شاد : جسے پاک رکھنے کی تھی ہوس وہ تو تیرے در پہ پہونچ گئی

نفس کی آمد و شد - آتش : کھلا یہ ہم کو دم نزع کے تنفس سے
شاد : پیغام آرہے ہیں تواتر وصال کے

افشائے راز عشق - آتش : وقت آخر عشق پنہاں یار پر ظاہر ہوا
شاد : تجھی کو نزع میں پوچھا ترے خموشوں نے

نہیں سمجھتے کہ ہے زیر پیرہن مٹی،
چھوڑا ابھی بروں در فکر درون خانہ کر
پاؤں پھیلانے کو ہاتھ آئے زمیں تھوڑی سی
میں بھی تو آدمی ہوں فراغت پسند ہوں
اُڑتے ہیں ہوش و حواس ادراک کے
اسی قدر اُسے حیرت ہے جس قدر سمجھا
دُنیا و آخرت سے کیا بے خبر مجھے
ہم اپنی چال سے آخر کہیں کے بھی نہ رہے
نظارہ کے قابل جو تماشا ہے تو یہ ہے
ہزار آنکھیں ہوں اور سب سے یار ہم دیکھیں
کس کو معلوم ہے فردائے قیامت کب ہے
کل قیامت جو نہ آئی تو قیامت سمجھو
دن ہو گیا نقاب جو شب کو اُٹھا دیا
نقاب ان کا الٹنا رات کا کافور ہو جانا
بڑھکر جو لے تو آگے خریدار کی پسند
قسمت کو پوچھتے ہو تو سونے کی تول ہے
دن وعدۂ وصال کے نزدیک آچکے
مُبارک ہو قضا خود لیکے فرمانِ اماں پہونچی
شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا
سلیقہ انتہا کا چاہئے موتی پرونے میں
اس گھر میں آنکلتے ہیں مہماں نئے نئے
دماغ اپنا ہے تازہ محکمہ قانون سازی کا
دکھلا رہی ہے گردش لیل و نہار رنگ
کھولو نہ راز گردشِ لیل و نہار کا
کچھ نہیں معلوم ہم کو روح کس عالم میں ہے
یہ جو مشت خاک زمیں پہ ہے اُسے پھینک آؤ کہیں سہی
کشاں کشاں لئے جاتا ہے شوق منزل کا
ہر ہر نفس فراق میں قاصد ہے یار کا
نزع نے عیسیٰ نے پہچانا مرے آزار کو
اخیر وقت جب آیا چھپے نہ راز ان کے

اختصار کے خیال سے اب ایک طرف آتش اور دوسری طرف شاد کے اشعار نقل کرتا ہوں آپ خود مماثلت پر توجہ کریں اور یہ

دیکھیں کہ دونوں میں کتنی ہم آہنگی ہے:

آتش:- سعی لاحاصل مداوائے جنون عشق ہے
تھا منا ممکن نہیں گرتی ہوئی دیوار کا
ہاتھ قاتل کا مرے خنجر تک آکر رہ گیا
کہنیوں تک آستینوں کو چڑھا کر رہ گیا
چھیڑ بیٹھے جو ہم افسانۂ گیسوئے دراز
صبح ہوگی نہ رہے گی شب یلدا باقی
مشکلِ نزع بھی آسان ہوئی جاتی ہے
نفس چند کی ہے روح کو ایذا باقی
ثبات اس کو نہیں یہ عالم واشد دو روزہ ہے
ہنسو اتنا بھی اے غنچو نہ تم کھل کھل گلستاں میں
عدم سے ہستی میں جاکر یہی کہوں گا میں
ہزاروں حسرت زندہ کو گاڑ داب آیا
نہیں دیکھا ہے لیکن تجھ کو پہچانا ہے آتش نے
بجا ہے اے صنم جو تجھکو دعویٰ ہے خدائی کا
چمنستاں کی گئی نشو و نما پھیرتی ہے
رت بدلتی ہے کوئی دن میں ہوا پھرتی ہے
عالم سے کچھ غرض نہیں اے جانِ جاں ہمیں،
دل کو نہیں ہے کوئی تمھارے، سوا قبول
کہاں تک آنکھوں میں سرخی شراب خواری سے
سفید مو ہوئے باز آ سیاہ کاری سے
راز دل افشا نہ ہوا ے دل کہے دیتا ہوں میں
پھوڑ ڈالی آنکھ اگر آنسو نظر آیا مجھے،
نافہمی اپنی پردہ ہے دیدار کے لئے
ورنہ کوئی نقاب نہیں یار کے لئے
حکایت گل رنگین یار کیا کہتے
چمن کو آگ لگاتا جو باغباں سنتا،
جنوں نے چل عدم کو یاں بھی گھبراتا ہے دم اپنا
کیا ہے تنگ وحشت نے ہماری عرصہ ہاموں کا
دو مریں گے زخم کاری سے تو حسرت سے ہزار
چار ہی ہاتھوں میں شل ہو جائیگا بازوئے دوست

شاد:- مرض کی دھیمی دھیمی آنچ کیا دھوکے میں رکھتی ہے
مریضِ عشق کب چیتا کہ جب نوبت بجاں پہونچی
ہماری جان صدقے نوجواں قاتل کے غصہ پر
کوئی انداز دیکھے آستینوں کے چڑھانے کا
جو کہوں تو ختم نہ ہو سکے جو سنے کوئی تو خلش رہے
یہ فسانہ زلف دراز کا مری زندگی سے دراز ہے
آخر ہے عمر ضیق میں دل بھی ہے جان بھی
مردانہ باش ختم ہے یہ امتحان بھی
یہاں نہ نشو و نما کا حاصل نہ کوئی ثمر ہے رنگ و بو کا
ہنسو گے خود اس چمن پہ غنچو زمانہ آئے ذرا نمو کا
ابھی بہت دل میں ہیں امیدیں تڑپ کے حسرت سے مر نہ جائے
ملو اگر شاد سے عزیزو تو ذکر کرنا نہ آرزو کا،
کچھ تعجب نہیں آنکھوں نے اگر مان لیا
دل نے دیکھا نہیں اس پر تجھے پہچان لیا
خزاں میں خشک شاخوں سے لپٹ کر مفت جی کھونا
بہار آئے گی گھبراؤ نہ اے اجڑے چمن والو
ہزار مجمع خوبان ماہ رو ہوگا،
نگاہ جس پہ ٹھہر جائے گی وہ تو ہوگا
اب اجتناب مناسب ہے شاد رندی سے
سفید آپ کے داڑھی کے بال ہونے لگے
ہجوم اشک سے دیدار میں خلل نہ پڑے
جو اب کے رو دوں تو آنکھوں کو میں نے پھوڑ دیا
گلہ جلوے کا تیرے کیا کہ عالم آشکارا ہے
ہمیں رونا تو جو کچھ ہے وہ اپنی کم نگاہی کا
جمالِ یار کا قصہ چمن میں چل کے کہو
گلوں کے کان کھڑے ہوں گے اس حکایت سے
پاؤں کی خاک ہیں ہم لاکھ بیاباں ایسے
ایک صحرا کو لئے پھرتی ہے وحشت میری
صف آخر میں ہوں میں وا اسفا اے قاتل
خون یہ ہے کہ تھکا جاتا ہے بازو تیرا

خوب روئے حال پر اپنے وطن کا سن کے حال
چمن کو یاد کر کے دیر تک آنسو بہاتا ہوں

کوئی غربت میں جو آنکلا ہمارے شہر سے
کوئی تنکا جو مل جاتا ہے اُجڑے آشیانے کا

ہمیشہ فکر سے یاں عاشقانہ شعر ڈھلتے ہیں
نہ آئینہ کا قصہ اور نہ حال شانہ کہتے ہیں

زباں کو اپنی بس اک حسن کا افسانہ آتا ہے
حقیقت میں جمالِ یار کا افسانہ کہتے ہیں

کرم کیا جو صنم نے ستم زیادہ کیا
کوئی خفا ہو تو ہو امر حق مگر یوں ہے

شب فراق میں میں نے خدا کو یاد کیا
بتوں کی چال نے سب کو خدا پرست کیا

سب سے روشن اور نمایاں پہلو دونوں کے کلام کا یہ ہے کہ دونوں حافظ شیراز سے بہت قریب تر ہیں۔ دونوں بادۂ حافظ کے جرعہ کش ہیں [1] اور متفاول رنگ بھی دونوں کے یہاں نمایاں ہے مگر چونکہ آتش فطرتاً باغ و بہار تھے ان کے لئے متفاول رنگ زیادہ نکھرا ہوا ہے شاد چونکہ فطری طور پر حسرت و غم کا مرقع تھے اس لئے ان کے یہاں یہ رنگ اتنا نمایاں نہیں اور نہ ہونا چاہئے تھا مگر پھر بھی جو ہے وہ غنیمت ہے۔

شاد کے کلام کا تجزیہ کیا جائے تو علاوہ دیگر متداول مضامین کے جو ان کے "خاصہ" کی چیز ہے وہ ان کا "خمریات" ہے۔ حیرت ہے نظیر صدیقی صاحب کی اس رائے پر کہ "شاد نے خمریات پر بھی توجہ کی ہے لیکن زیادہ تر رسمی، وہی شراب کی ندانہ تعریف، وہی زاہد کی علم مے نوشی پر طنز، وہی ساقی کی نشیلی آنکھوں کا تذکرہ جو قدما کے عہد سے چلا آرہا تھا ان کے یہاں بھی ہے اور اس میں بھی کیف و سرور اور جوش و مستی کے عناصر بہت کم ہیں" [1] لیکن کلام شاد کے آئینہ میں اس تنقید کے خط و خال کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ یہ تنقید شاد کے کلام پر صادق نہیں آتی۔ اب ایک ایک کر کے ان کو پرکھئے۔

جہاں تک رسمی مضامین کا تعلق ہے، یہ امر روزِ روشن کی طرح واضح ہے کہ شاد کے یہاں مے نوشی عبادت ہے، میکدہ کا احترام فرض ہے، ان کے خمریات کی ایک خاص ٹکنیک ہے۔ ساقی اور پیر مغاں کا خاص مفہوم ہے اور مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ انکے مذہبی خیالات کی ترجمانی بھی انہی خمریاتی شاعری کے ذریعہ ہوتی ہے۔ یہ غزل ملاحظہ ہو:-

اداؤں میں کرامت ناز میں اعجاز ساقی کا
نہ بھولے گا ہمیں اے میکشو انداز ساقی کا

بجز پیرِ مغاں کے کس نے کی تعظیم ساقی کی
وہی کچھ جانتا تھا میکشو اعزاز ساقی کا

سبو ہو، جام ہو، مینا ہو سب منہ تکنے والے تھے
بھری محفل میں آخر کون تھا دمساز ساقی کا

تھکے وہ لب نہ مت جس سے نکلے ساغر مے کی
خدا رسوا کرے اس کو جو ہو غماز ساقی کا

پوری غزل کی غزل ایک رنگ میں ہے۔

کیا اس قسم کی شاعری کو رسمی کہیں گے۔ ایک دوسری غزل جس کی ردیف ہے "میں قربان ساقی پر" اسی ایک رنگ میں ہے:

خمریاتی رنگ نہ میں نے قدما کے کلام میں پایا اور نہ شاد کے معاصرین میں، یکرنگی غزلوں کو جانے دیجئے، منفرد اشعار جو مے و مینا کی اصطلاحی زبان میں ادا ہو گئے ہیں، شاد کے مخصوص رنگ اور انداز بیان کی غمازی کرتے ہیں اور کوئی دوسرا شاعر ان کا حریف نہیں ہو سکتا۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

لے کے خود پیر مغاں ہاتھ میں مینا آیا
میکشو شرم کہ اس پر بھی نہ پینا آیا

غنچے ہیں متحیر، متبسم ساقی
پینے والے تجھے پینے کا نہ انداز آیا

---

[1] نگار دسمبر ۱۹۴۹ء ص ۵

اسی امید میں باندھے ہوئے ہیں ٹکٹکی میکش
کفِ نازک پہ ساقی رکھ کے اک دن جام آئیگا

ایک چھوٹی سی غزل کے چند اشعار سنئے :۔

ساغر ہمارا ، مینا ہمارا
جنت ہماری ، طوبیٰ ہمارا

داتا کے در سے لیکر پھریں گے
بھر دے گا اکدن کاسا ہمارا

مے پر کسی کو ، خم پر کسی کو
ساقی پہ اپنے دعویٰ ہمارا

کیا ان اشعار میں کیف و سرور، جوش و مستی اور والہانہ انداز کا فقدان ہے ؟ ۔ چند اشعار اور اسی رنگ کے ملاحظہ ہوں :۔

بچا کے ہات الگ سے الگ سبو لیتے
یہ کیا مجال کہ ساقی کے ہاتھ چھو لیتے

حریفِ بزم میں گستاخ ہو چلے ساقی
ذرا تو کھیل سے آنکھوں کو خشمگیں کر لے

ساقی کی چشمِ مست پہ مشکل نہیں نگاہ
مشکل سنبھالنا ہے دلِ بے قرار کا

کہاں سے لاؤں صبرِ حضرتِ ایوب اے ساقی
خم آئے گا صراحی آئے گی تب جام آئے گا

نہ دے الزام بدمستی کا اک افتادہ تھی ساقی
مرا گرنا بھرے ساغر کا چکنا چور ہو جانا

غضب نگاہ نے ساقی کی بندوبست کیا
شراب بعد کو دی ، پہلے سب کو مست کیا

دے کے تہی سبو مجھے صبر کا حوصلہ دیا
جس کی طلب تھی ساقیا اس سے کہیں سوا دیا

مشتاق کب سے ہم ہیں فقط ایک جام کے
قربان اپنے ساقیِ مہوش کے نام کے

دیکھا کئے وہ مست نگاہوں سے بار بار
جب تک شراب آئے کئی دور ہو گئے

یہ بزمِ مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھکر خود اٹھالے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

برا اس بزم میں سمجھا یا بھلا میں ،
خدا حافظ ہے اے ساقی ! چلا میں !!

خمخانۂ آتش بھی کچھ کم سرور افزا نہیں ، گرچہ شاد کے میخانہ کی تندی اور سرشاری نہیں مگر پھر بھی ان کی شراب کو دو آتشہ کہنا ہی پڑے گا ۔ مثالیں دیکھئے :۔

آتش مست جو مل جائے تو اس سے پوچھوں
تو نے کیفیت اٹھائی ہے خرابات میں کیا

شکرانۂ ساقی ازل کرتا ہے آتش ،
لبریزِ مئے شوق سے پیمانہ ہے اس کا

بوئے مے رکھتی ہے اس میکدہ میں کیفیت
محتسب توڑ کے شیشہ کو پشیماں ہوگا

ساقیِ میکدہ نے مجھ کو یہ خدمت دی ہے
نشہ میں مست جو گرتا ہے اٹھاتا ہوں میں

مگر اس کو فریبِ نرگسِ مستانہ آتا ہے ،
الٹتی ہیں صنمیں گردش میں جب پیمانہ آتا ہے

نشۂ مے نے نقاب رخ زیبا الٹا
ٹھوکریں کھاتی ان آنکھوں کی حیا پھرتی ہے

خدا جانے کہ ہوگا حال کیا ہم بادہ نوشوں کا
لڑا کر جام سے توڑا ہے بدمستی میں مینا کو

متفادلِ رنگ آتش کے کلام میں جو چہکار اور لپک ہے وہ ان کا خاص طرۂ امتیاز ہے ۔ اردو میں شاید ہی کوئی شاعر جوش مسرت سے اتنا لبریز اور سرشار ہو ۔ ان کے سارے کلام میں جوشِ نشاط اور سرورِ حیات اتنا رچا ہوا ہے کہ غم آگیں مضامین ان کے چہرے پر نہیں کھلتے ۔ ملاحظہ ہو :

جامہ سے باہر اپنے جو ہوں میں عجب نہیں ،
کھولے ہیں کس کے بند قبا کچھ نہ پوچھئے

ہوائے دورِ مئے خوشگوار راہ میں ہے
خزاں چمن سے ہے جاتی بہار راہ میں ہے

بہار آئی، مرادِ چمن خدا نے دی — شگفتہ غنچہ ہوئے بوئے گل صبا نے دی
چمنستاں کی گئی نشو و نما پھرتی ہے، — رُت بدلتی ہے کوئی دن میں ہوا پھرتی ہے
خوشی سے جامے میں پھولا نہیں سماتا ہے — بہارِ گل کی جو آمد ہے باغباں سنتا،
کوچۂ یار میں چلئے تو غزل خواں چلئے — بلبلِ مست کی صورت سے گلستاں چلئے
رنگ بدلا نظر آتا ہے ہوا کا مجھکو — گلِ تازہ کوئی اس باغ میں خنداں ہوگا
ہائے خُم مستوں کے ہو حق کا جو عالم ہو سو ہے — سر منبر وہی واعظ کا بیاں ہے کہ جو تھا

شاد اپنی نظرت کے لحاظ سے تمثائم واقع ہوئے ہیں اور اس حقیقت سے وہ میر سے زیادہ مشابہت رکھتے ہیں۔ مگر کہیں کہیں سرور و شادمانی کی جھلک بھی نمایاں ہو جاتی ہے اور متفاد دل رنگ ان کے کلام میں بھی جھلکتا ہے۔ مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

خزاں میں خشک شاخوں سے لپٹ کر مفت جی کھونا — بہار آئے گی گھبراؤ نہ اے اُجڑے چمن والو
دو چار نالے اور کرو صبح ہو چلی — ہاں عاشقو بس اب شبِ فرقت تمام ہے
سدھاری تیرہ بختی منزلوں تک چاندنی چھٹکی — مرے گھر چودھویں کا چاند بن کر تو حسیں آیا
ہنسی خوشی سے زمانہ بسر کیا اے شاد — مثال نخل گلستاں نہال ہوکے رہے

شاد کے غم آشنا اور یاس پرور دل سے بہجت آفریں نغمے نکل ہی نہیں سکتے تھے ان کا دیوان حزن و یاس کا گنجینہ اور غم والم کا سفینہ ہے، کیونکہ ان کی ساری عمر ناکامی اور پریشاں حالی میں گزری، عظیم آباد کی فارغ البالی دم توڑ رہی تھی، عزیزوں اور وطن والوں نے کوئی دقیقہ ان کی رسوائی اور بدنامی کا اٹھا نہ رکھا، "اپنے" کا سارا زورِ قلم ایک بیچارے شاد کے لئے وقف تھا۔ چنانچہ انکے کلام میں جابجا اس کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے:

حریفوں نے کہا سب کچھ ادھر روئے سخن کرکے — مگر بیٹھے ہیں خاموشی کو ہم قفلِ دہن کرکے
گلوں نے خاروں کے چھیڑنے پر بجز خموشی کے دم نہ مارا — شریف الجھیں اگر کسی سے تو پھر شرافت کہاں رہے گی
بتا دیا مجھے بچ بچ کے راستہ چلنا — خدا بھلا کرے اے شاد نکتہ چینوں کا

آتش اور شاد دونوں کے کلام میں "رمزیت" اور "اشاریت" بدرجۂ اتم ہیں۔ اور اس حیثیت سے دونوں اُردو کے حافظ کہے جا سکتے ہیں۔ آتش خود کہتے ہیں:۔

غزل خواجہ ہے، مطلب کو پہونچ اے آتش — نالۂ بے اثرِ مرغ نوا سنج نہیں

اور شاد تو اپنے حافظ وقت ہونے کا دعویٰ اس طرح کرتے ہیں:۔

شعر کہتے ہیں کسے بزم میں کھل جائے گا — شاد آیا نہ کہو حافظِ شیراز آیا

دونوں کے یہاں ہم کو ایسے اشعار نظر آتے ہیں جو حافظ کے اشعار کا ترجمہ معلوم ہوتے ہیں مثلاً:۔

حافظ:	شاد:
غرض ز مسجد و میخانہ ام وصالِ نگار است	تبکدہ ہے کہ خرابات ہے یا مسجد ہے
جز این خیال ندارم خدا گواہ من است	ہم تو صرف آپ کے طالب ہیں خدا شاہد ہے
اور پیالہ عکسِ رخِ یار دیدہ ایم	دیر تک میں ٹکٹکی باندھے ہوئے دیکھا کیا
اے بے خبر ز لذتِ شربِ مدام ما	چہرۂ ساقی نمایاں صاف پیمانے میں تھا
در مجلسِ صبوحی، دانی چہ خوش نماید	اُٹھا لو جام کو رند و وبالِ جاں ہے مے پینا
عکسِ عذارِ ساقی بر جام مے فتادہ	مجھے ہنستا ہوا ساقی کا چہرہ یاد آتا ہے

سرقہ، توارد، استفادہ

(بسلسلۂ سابق)

(۲) حکیم سنائی کا شعر ہے:-

رفتم از ہوش وقتِ رفتنِ یار او چناں رفت و من چنیں رفتم

وداع محبوب کو جس انداز سے پیش کیا ہے اس سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر اس شعر میں صرف ایک واقعہ کا ذکر کر دینا چاہتا ہے جس میں کوئی بات بھی جذبات سے اپیل کرنے والی نہیں ہے۔ اس کے برخلاف حکیم شفائی نے اسی مضمون کو پیش کیا ہے:

غافل زخود شدیم بکوشش گہہ وداع خود را ز اضطراب ہمانجا گزاشتیم

"رفتم از ہوش" سے کچھ ایسا مفہوم متبادر ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ اپنے اختیار سے کیا گیا ہے اور شعر میں لے دے کے صرف یہی ایک جملہ ہے جس میں جذبات کا کوئی جزو ملتا ہے اس کے مقابلہ میں "غافل زخود شدیم" کی بلاغت ظاہر ہے اور دوسرے مصرعہ میں تو سراپا جذبات ہی ہیں۔ پھر انداز بیان نے اس کو ظاہر کر دیا ہے کہ یہ جذبات نہیں بلکہ واردات ہے اور اس اعتبار سے دونوں شعروں کا فرق ظاہر ہے۔

(۳) غالب کا شعر ہے:

سینہ بکشودیم و خلقے دید کانجا آتش ست بعدازیں گویند آتش را کہ گویا آتش ست

غالب نے اس شعر کے مضمون کو جس طرح ترتیب دیا ہے اس میں گرمی دل کی شدت کا اظہار مقصود ہے وہ صرف یہ امر ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ میرے سینے میں جو آگ دہک رہی ہے وہی حقیقت میں آگ ہے۔ لیکن اس شعر میں جذبات کا کہیں نام و نشان نہیں۔ اس کے برخلاف اردو میں ایک شعر اسی مفہوم کا غالب نے کہا ہے:-

آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں سوزِ غمہائے نہانی اور ہے

حالانکہ اس شعر میں سوزِ غم کا مقابلہ معمولی آگ کے بجائے آتشِ دوزخ سے ہے مگر اس شعر کا اسلوب بیان بالکل جذباتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ شاعر اپنی واردات بیان کر رہا ہے۔ حالانکہ مضمون یکساں ہے مگر اس شعر کی زبان جذباتی ہونے کی وجہ سے اس میں اثر بہت بڑھ گیا ہے۔

(۴) نظیری کی ایک ہی غزل کے دو شعر ہیں۔ اندازہ کرنا چاہئے کہ دونوں میں کیا فرق ہے:-

(۱) بجنت سوز عشقش گر نباشد، شود بر مومن آب کوثر آتش

(۲) نظیری کام دل از سوختن جو، شود پروانہ را ہال و پر آتش

پہلے شعر میں معلوم ہوتا ہے کہ فقہ یا فلسفہ کا کوئی مسئلہ بیان کیا جا رہا ہے جو بالکل تخئیل یا علم سے متعلق ہے، لیکن دوسرا شعر سرتاپا جذباتی ہے اور اس لئے اس میں اثر و گداز بڑھ گیا ہے۔

(۵) خواجہ حافظ نے ذیل کے دونوں شعروں میں ہجر کی ایک مخصوص حالت کو پیش کیا ہے اور دونوں شعروں میں سوز ہجر کا ذکر ہے۔

(۱) تنم از واسطۂ دوریٔ دلبر بگداخت جانم از آتشِ ہجرِ رخِ جانانہ بسوخت

(۲) بے روئے دل آرائے تو اے شمعِ دل افروز دل رقص کناں بر سر آتش چو کباب ست

پہلے شعر میں جذبات نہیں ہیں بلکہ جان و تن پر جو مختلف اثرات ہجر کے ہیں ان کا بیان ہے لیکن دوسرے شعر میں حالانکہ جان و تن کا ذکر نہیں ہے

لیکن چونکہ جذبات کی زبان سے سب کچھ کہا گیا ہے اس لئے وہ واردات بن گیا ہے اور دونوں شعروں میں جو زمین و آسمان کا فرق ہے ظاہر ہے
ان مثالوں سے اس امر کی تشریح مقصود تھی کہ بعض اوقات وارداتی شاعری اور تخیلی شاعری میں بہت تھوڑا اور بہت ہی نازک فرق ہوتا ہے اور اس کو نگاہ میں رکھنا بیحد ضروری ہے۔

تخیلی شاعری ایسی چیز ہے کہ اس میں توارد ہونے کے امکانات بہت زیادہ ہیں، اس لئے کہ ایک ملک میں نصاب تعلیم۔ طریق بود و ماند۔ طرز فکر۔ آداب معاشرت وغیرہ میں اس طرح کی یکسانیت و یکرنگی ہوتی ہے کہ تخیل و تصور میں بغیر ارادہ کے اتحاد و یکسانیت پیدا ہو جانا لازم ہے۔ علاوہ اس کے اگر کوئی شاعر اپنے پیشروؤں کے خیالات کو اپنے رنگ میں پیش کرتا ہے تو اس کو سرقہ نہ سمجھنا چاہئے۔ عربی کے دو ضرب الامثال مولانا حالی نے مقدمہ شعر و شاعری میں نقل کئے ہیں کہ "لم تترک الاول الآخر" اور "کم تترک الاول الآخر" یعنی پہلے پچھلوں کے لئے کچھ نہیں چھوڑ گئے اور پہلوں نے پچھلوں کے لئے بہت کچھ چھوڑا ہے۔ جب ان دونوں ضرب الامثال پر مجموعی طور سے نظر کیجائے تو اس کا مطلب یہی ہوگا کہ کوئی نیا مضمون ایسا نہیں ہے جو پہلوں نے نہ کہدیا ہو اس لئے پچھلوں کو نیا مضمون نہ ملے گا، اور دوسرے جملہ کا مطلب یہ ہے کہ اگلے بہت کچھ جمع کر کے چھوڑ گئے ہیں جس سے وہ استفادہ کر سکتے ہیں۔ یہاں اس کا لحاظ بھی ضروری ہے کہ عرب اپنے قدماء سے استفادہ کرنا معیوب نہ سمجھتے تھے جیسا کہ عربی کے اس دوسرے جملہ سے واضح ہوتا ہے۔ حضرت کعب ابن زبیر جو سبعہ ملقہ میں شریک ہیں اور جاہلیت و اسلام میں یکساں ممتاز شاعر رہے ہیں فرماتے ہیں:

ما ارانا نقول الا معارا او معاداً من قولنا مکرورا

یعنی ہم جو کہتے ہیں وہ اگلوں سے مستعار لیا ہوا خیال ہوتا ہے یا اپنے ہی ایک بار کے کہے ہوئے کو دہراتے ہیں۔

شاعر ابو نواس نے فضل بن ربیع کی شان میں یہ شعر کہا تھا:

لیس علی اللہ بمستنکر ان یجمع العالم فی واحد

یعنی اللہ تعالیٰ کے لئے یہ کیا دشوار ہے کہ وہ ایک شخص واحد کی ذات میں ایک عالم کو جمع کر دے۔

اس شعر میں چونکہ مضمون نیا تھا اور بلند تھا۔ شعر بغداد کی گلیوں تک میں ہر شخص کی زبان پر آ گیا۔ کسی نے ابو نواس سے دریافت کیا کہ اس مضمون تک رسائی کیونکر ہوئی تو اس نے صاف کہدیا کہ جریر کے اس شعر سے میں نے یہ خیالی اخذ کیا ہے کہ:

اذا غضبت علیک بنو تمیم حسبت الناس کلہم غضابا

یعنی جب بنو تمیم تم سے ناراض ہو جائیں تو سمجھ لو کہ تمام ہی آدم ناراض ہو گئے۔

ابو نواس کوئی معمولی شاعر نہیں ہے کہ نہایت بلند پایہ شاعر گزرا ہے مگر اس نے جریر سے استفادہ کیا اور۔ اس کا صاف الفاظ میں اعتراف بھی کر لیا۔ اس واقعہ سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ قدماء سے متاخرین نے کس طرح مضامین اخذ کئے ہیں۔

مولانا نظامی گنجوی کے خمسہ کا جواب لکھنے کی جرأت کوئی شاعر نہ کر سکا تا آنکہ حضرت امیر خسرو کا زمانہ آ گیا اور موصوف نے سب سے پہلے خمسۂ نظامی پر خمسہ لکھا اور پہلی ہی مثنوی مطلع الانوار میں مولانا نظامی سے استفادہ کرنے کا اعتراف کیا ہے فرماتے ہیں:۔

گرچہ بملک سخن از پنج گنج، نوبت آں گنجہ بشہ گشت پنج
نوبت خسرو کہ پسیچش نواست، پنجہ آں نوبت آں خسرو است
سازم ازاں ساں بسرائے پسنج پنج کلید از پے آں پنج گنج
آں نمط آرم کہ ہمہ ناقداں فرق ندانند ازیں تا بداں
ملک سخن را چو گرفتم بہ تیغ گوہر خود نیز فشندم چو میغ

آخر کے دو شعروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا نظامی کی روش طرز بیان۔ مضمون وغیرہ کا لفظاً معناً اتباع کیا ہے مگر اسکے باوجود

بعض اصحاب نے مولانا نظامی کی پیروی کرنے کے سلسلہ میں حضرت امیر خسرو پر اعتراض کیا تو اس کا جواب مثنوی مجنوں و لیلیٰ میں اس طرح دیتے ہیں :-

گر ما ز ہنر تہی میانیم — بارے تو بگوئے تا بدانیم
از دعوئے این خیال سنجی — ناگفتہ ملاف تا نہ رنجی،
بنود چو فسانۂ تو نامی، — بیہودہ چہ لافی از نظامی
گفتی دم اوست مردہ رازیست — آں زانِ وے است زان تو چیست
گر زان قدح آرے آب خوردم — بے گفت تو اعتراف کردم

آخری شعر میں کس طرح بالکل کھلے لفظوں میں مولانا سے استفادہ کرنے کا اعتراف کر رہے ہیں۔ حضرت امیر کے بعد خواجہ کرمانی نے اپنا خمسہ مرتب کیا۔ خواجہ کرمانی، مسرو کے لئے کہتے ہیں :-

سوختم این لخلخۂ خسروی — در طبق موہبتِ مولوی

مولوی سے مراد مولانا نظامی ہیں

شمس العلماء، مولوی محمد حسین آزاد نے ذوق کا واقعہ آبِ حیات میں لکھا ہے کہ موصوف قصیدہ لکھ رہے تھے جس کا مطلع ہے:

زہے نشاط کہ گر کیجئے اُسے تحریر — عیاں ہو خامہ سے تحریر نغمہ جائے صریر

اس کے اشعار آزاد کو سنا رہے تھے، درمیان میں چند بار اس خیال کا بھی اظہار کیا کہ اسی عقیدہ میں خواجہ حافظ کا یہ شعر بھی تضمین کرینگے

مے دو سالہ و محبوب چاردہ سالہ — ہمیں بس است مرا صحبت صغیر و کبیر

اس کے چند روز کے بعد جو آزاد وہاں گئے تو ذوق نے حسب ذیل قطعہ سنایا :-

ہوا ہے مدرسہ بھی درسگاہ عیش و نشاط — کہ شمس بازغہ کی جا پڑھیں ہیں بدر منیر
اگر پیالہ ہے صغرا تو ہے سبو کبرےٰ — نتیجہ یہ ہے کہ سرمست ہیں صغیر و کبیر

اور اس کے بعد آزاد کی طرف دیکھ کر فرمایا "اب بھی ؟" انھوں نے کہا "سبحان اللہ، اب اس کی کیا ضرورت رہی" آنکھیں بند کر کے فرمایا "اُدھر ہی کا فیضان ہے (آب حیات صفحہ ۴۶۴ و ۴۶۵) جو زور حافظ کے شعر میں ہے ذوق کے یہاں نہیں ہے مگر حافظ سے استفادہ کرنے کے ذوق خود معترف ہیں، جیسا کہ آزاد کے بیان سے واضح ہوتا ہے۔

انگلستان کا مشہور و معروف شاعر رابرٹ براؤننگ (Robert Browning) جو انیسویں صدی میں ہوا ہے صاف الفاظ میں کہتا ہے کہ

And many a thought did I benefit upon
Thought. As the wild bee hangs from cell to cell.

یعنی میں نے بہت سے خیالات دوسرے خیالات سے پیدا کئے ہیں جس طرح شہد کی مکھی ایک خلیہ سے دوسرے خلیہ کی طرف جاتی ہے۔

انگلستان کا ایک دوسرا مشہور مصنف کالٹن (C. C. Colton) جس کا انتقال ۱۸۳۲ء میں ہوا ہے اپنی کتاب (Lacon) میں کہتا ہے:

Subtract from many modern poets all that may be found in Shakespeare, & trash will remain Ref N. 568

گویا دنیا جن لوگوں کی شاعرانہ عظمت کے گیت گا رہی ہے ان کے دامن میں کچھ بھی نہیں ہے ان میں سے اکثر شیکسپیر کی خوشہ چینی کر کے نام آوری حاصل کر رہے ہیں۔ ناسخ نے ایک جگہ بالکل صاف ہی کہدیا ہے کہ :

نہیں ممکن کہ نئی ساری غزل ہو ناسخ — باتیں دو چار پرانی ہیں تو دو چار نئی

اسی طرح بالکل صاف اور واضح الفاظ میں انیسویں صدی کے انگریزی شاعر جان کیبل (Rev. John Keble) نے کہا ہے:

As fire is kindled by fire, so is a poets mind kindled by contact with a kindred poet

یعنی جس طرح ایک آگ سے دوسری آگ روشن کی جاتی ہے اس طرح ایک شاعر کا دماغ اپنے بھائی دوسرے شاعر کے کلام سے روشن ہوتا ہے۔

الغرض ہر زبان کے شعرا اور مصنفین اپنے پیشروؤں سے برابر استفادہ کرتے رہے ہیں اور خود ہی اس کا کھلے لفظوں میں اقرار بھی کرتے رہے ہیں اگر قایلین کے متذکرہ اصول کے مطابق متقدمین سے استفادہ کرنا ان بلند پایہ شعراء کے نزدیک بھی معیوب ہوتا تو اس طرح کھلے لفظوں میں اس کا اقرار نہ کرتے۔

علامہ شبلی شعر العجم میں تحریر فرماتے ہیں کہ "اول اول ایرانی شعرا عربی شاعری سامنے رکھ کر شعر کہتے تھے۔ مشق کی ابتدا یہ تھی کہ عربی اشعار کا لفظی ترجمہ کرتے تھے۔ آج بہت سے فارسی قطعے۔ فرد بلکہ قصیدے موجود ہیں جن کو عام لوگ ایران کا سرمایہ سمجھتے ہیں درحقیقت وہ عربی اشعار کے ترجمے ہیں اور مترجموں نے دانستہ ترجمہ کیا ہے کہ شعراء کے لئے نمونے ہاتھ آئیں" (شعر العجم جلد چہارم صفحہ ۱۳۲) اسکے بعد ترجمہ کی چند مثالیں پیش کی ہیں اور اس کے بعد کہتے ہیں "اس پردہ میں سرقہ شروع ہوگیا۔ عنصری۔ اسدی۔ کسائی۔ غضاری کے ہاں بہت سے مضامین ہیں جو قطعاً عرب سے لئے ہیں لیکن چونکہ لوگوں کی نظر کلام عرب پر نہیں ہے اس لئے کسی نے سرقہ یا ترجمہ خیال نہیں کیا۔ مجمع الصنایع وغیرہ میں سرقہ کی مثالیں کثرت سے نقل کی گئی ہیں، لیکن ان اشعار کا ذکر تک نہیں آتا۔ اس قسم کے سرقات میں ہم مثالیں نقل کرتے ہیں۔ یہ لحوظ رکھنا چاہئے کہ یہ مضامین شعرائے عرب کے مخصوص اور ممتاز مضامین ہیں جن سے کوئی عربی داں ناواقف نہیں رہ سکتا اس لئے توارد کا خیال صحیح نہیں ہوسکتا" (شعر العجم جلد چہارم صفحہ ۱۳۰)۔ اس عبارت کے بعد مولانا نے سرقہ کی چند مثالیں درج کی ہیں ہم بخوف طوالت ان کو قلم انداز کرتے ہیں صرف آخری مثال پیش کرتے ہیں۔ باقی بھی اسی طرح کی ہیں۔ فرماتے ہیں کہ "برسات میں جو کیڑے مکوڑے پیدا ہو جاتے ہیں عربی میں ان کو اولاد الزنا کہتے ہیں"۔ مشہور ہے کہ جب سہیل ستارہ نکلتا ہے تو یہ حشرات الارض فنا ہو جاتے ہیں۔ متنبی نے اس سے یہ مضمون پیدا کیا ہے:

وتنکر موتہم وانا سہیل طلعت بموت اولاد الزنا

"میں سہیل ہوں اور میرے دشمن حشرات الارض ہیں جب میں نمایاں ہوا تو وہ فنا ہو گئے"۔ نظامی نے بعینہ اس مضمون کو لے لیا چنانچہ قصیدہ فخریہ میں فرماتے ہیں:

ولد الزنا ست حاسد منم آنکہ طالع من ولد الزنا کش آمد چو ستارۂ سہیلی (شعر العجم جلد چہارم صفحہ ۱۳۸)

مولانا شبلی کے متذکرہ بیان کے متعلق ہم موصوف سے بصد ادب اختلاف کرنے پر مجبور ہیں۔ اس تمام بیان میں چند امور غور طلب ہیں:-

(۱) مولانا کو تسلیم ہے کہ عربی قطعے۔ فرد بلکہ قصیدے تک ترجمہ کئے گئے۔

(۲) مولانا کو یہ بھی تسلیم ہے کہ یہ سب کچھ حسن نیت سے فارسی شاعری کو ترقی دینے کے لئے کیا گیا۔

(۳) مولانا یہ بھی واضح کر دیتے ہیں کہ جن ترجموں کو وہ سرقہ قرار دے رہے ہیں وہ عربی کے مخصوص و ممتاز مضامین ہیں جن سے کوئی عربی داں ناواقف نہیں رہ سکتا۔

(۴) مولانا اس کی کوئی وجہ بیان نہیں کرتے کہ کیوں ایک ترجمہ کو وہ ترجمہ ہی قرار دیتے ہیں اور دوسرے کو سرقہ۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ متنبی اور مولانا نظامی کے اشعار کو مولانا شبلی پیش کرتے ہیں اور نظامی کو سرقہ کا مجرم قرار دیتے ہیں لیکن مولوی محمد حسین آزاد نے اس کو ترجمہ کی سند میں پیش کیا ہے۔ چنانچہ آب حیات میں سودا کے ذکر میں ہے "ان کا (یعنی سودا کا) ایک شعر اور ایسا ہی ہے

بہار بے سپر و جام دیار گزرے ہے نسیم تیر سی سینہ کے پار گزرے ہے

فارسی میں کوئی استاد کہتا ہے:۔

بہار بے سپر جام و یار می گزرد نسیم ہجو خدنگ از کنار می گزرد

مگر اہلِ تحقیق کا قول ہے کہ ایسی صورت خاص کو سرقہ نہیں ترجمہ سمجھنا چاہئے کیونکہ شعر کو شعر ہی میں ترجمہ کرنا بھی ایک دشوار صنعت ہے۔ قطع نظر اس کے اسی مطلع کے بعد اور اشعار کو دیکھو کیا موتی پروئے ہیں اور کلیات ایک دریا ہے کہ اقسام جواہر سے بھرا ہوا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اس رتبہ کا شاعر ایک مطلع کا محتاج تھا اس لئے چرالیا۔ ابوالفضل نے ایک مراسلہ میں لکھا ہے:

ولد الزنا ست حاسد منم آنکہ طالع من ولد الزنا کش آمد چو ستارۂ یمانی

یہ شعر قصاید نظامی میں موجود ہے اور اسی مضمون کو عربی میں متنبی کہتا ہے:۔

وتنکر موتہم و انا سہیل طلعت بموت اولاد الزنا" (آب حیات تذکرۂ سودا ص۱۴۳)

ہمیں تسلیم ہے کہ عربی شعراء کے کلام کا ترجمہ جس غرض سے شروع کیا گیا تھا وہ غرض مولانا نظامی کے عہد میں باقی نہ تھی اور فارسی شاعری خود اتنی ترقی کر چکی تھی کہ عربی سے نمونے حاصل کرنے کی ضرورت ہی نہ رہی تھی مگر شاعری کی شریعت میں شعرائے سابق کی سنت کی پیروی ایمان کا درجہ رکھتی ہے اور عربی اشعار کے ترجمہ کرنے کا طریقہ ایک ضرورت کے تحت شروع کیا گیا تھا جب وہ ضرورت رفع ہوگئی تب بھی عمدہ خیالوں اور بہتر اشعار کے ترجمہ کا طریقہ برابر جاری رہا اور آج تک جاری ہے۔ مولانا شبلی نے جن اشعار کو سرقہ کہا ہے اگر وہ سرقہ ہی ہیں تو پھر ترجمہ کس چیز کا نام ہے؟

ہمارے نزدیک تخیلی شاعری میں سرقہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ اول تو قدما کے یہاں ہر قسم کے مضامین موجود ہیں جیسا کہ عربی کے دو متذکرہ جملوں سے ظاہر ہوتا ہے لامحالہ انھیں انہی خیالات کو دہرانا ہے پھر اگر قصداً استفادہ کیا جائے تو بھی چنداں مضایقہ نہیں ہے دوسرے شعرا کو مشورہ یہی دیا گیا ہے کہ وہ اپنے پیشروؤں کے خیالات سے استفادہ کریں جیسا کہ نظامی عروضی سمرقندی چہار مقالہ میں کہتا ہے "اما شاعر بدین درجہ نرسد کہ در عنفوان شباب و روزگار جوانی بست ہزار شعر از اشعار متقدمین یاد گیرد و ہزار کلمہ از آثار متاخرین در پیش چشم کند و پیوستہ دواوین استادان خواند و عروض بخواند و گرد تصانیف استاد ابوالحسن سرخسی گردد مانند غایت العروضین و کنز القافیہ و نقد معانی و نقد الفاظ و سرقات و تراجم و انواع این علوم بخواند" (چہار مقالہ نظامی عروضی سمرقندی)

نظامی کے خیالات کا ماحصل یہ ہے کہ جو روش قدما نے اختیار کی اور جن خیالات کا انھوں نے اظہار کیا اس پر بالکلیۃً عبور ہونا ایک شاعر کے لئے لازمی ہے اور اپنے عہد کے مقتضیات و داعیات سے بھی باخبر ہونا شاعر کے لئے ضروری ہے۔ گویا خیالات و روش وہی پرانی ہونا چاہئے، اور زبان و طرز بیان اپنے زمانہ کے مطابق ہو۔ ایسی حالت میں مفہوم صرف یہ ہوا کہ پہلوں کے خیالات سے مستفید ہونا ضروری ہے اور استفادہ کرنا کوئی معیوب چیز نہیں۔

ذیل میں ہم چند مثالیں اس کی درج کرتے ہیں کہ خیالات میں قدما سے استفادہ کر کے متاخرین نے کس کس طرح اُن مضامین میں اضافہ کیا ہے۔

(۱) کسی فارسی شاعر کا شعر ہے:۔

بزمیں چو سجدہ کردم ز زمیں صدا برآمد کہ مرا خراب کردی تو بسجدۂ ریائی

مشہور یہ ہے کہ یہ شعر مولانا عراقی کا ہے، مگر ہمارے مطالعہ میں دیوان عراقی کا جو نسخہ ہے اس میں یہ شعر موجود نہیں ہے۔ اس شعر میں شاعر صرف ریا کی مذمت کرنا چاہتا ہے کہ وہ اتنی بری چیز ہے کہ زمین بھی اس سے پناہ مانگتی ہے۔ علامہ اقبال نے غالباً اسی شعر سے ذیل کا مضمون پیدا کیا ہے

کبھی سر بسجدہ ہوا جو میں تو زمیں سے آنے لگی صدا ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

فارسی شعر کے پہلے مصرعہ کا ٹھیک لفظی ترجمہ اقبال کے پہلے مصرعہ میں موجود ہے لیکن دوسرا مصرعہ حضرت امیر خسرو کے ایک شعر سے قریب تر ہے حضرت امیر کا شعر ہے:۔ مسجد روم چندیں آخر چہ نمازست ایں ردیم بسوئے قبلہ دل جانب ابرویت

اگر یہ کہا جائے تو ایک حد تک درست ہوگا کہ اقبال کا دوسرا مصرعہ خسرو کے دوسرے مصرعہ کا آزاد ترجمہ ہے:۔

(۲) ابو شکور بلخی کا شعر ہے:۔

تا بد آنجا رسیدہ دانش من کہ بدانم ہمی کہ نادانم،

مشہور ہے کہ کسی نے سقراط سے پوچھا کہ "آپ کا علم کس حد تک پہونچ چکا ہے؟" سقراط نے جواب دیا کہ "مجھے اب یہ علم حاصل ہوا ہے کہ میں کچھ نہیں جانتا"۔ معترض نے کہا کہ "اگر یہ بات ہے تو کسان جو کھیتوں میں ہل چلاتے ہیں ان میں اور آپ میں کیا فرق ہے؟" سقراط نے کہا کہ:۔ "یہ فرق ہے کہ میں اس کو جانتا ہوں کہ میں نہیں جانتا اور یہ کسان اس کو نہیں جانتے کہ یہ نہیں جانتے"۔

ابو شکور نے جہل کا علم حاصل ہو جانے کو اپنی دانش کی انتہا بتایا مگر واضح الفاظ میں نہیں کہا ہے۔ خواجہ میر درد نے اسی مضمون کو زیادہ وضاحت سے کہدیا ہے:۔

یہی جانا کہ کچھ نہ جانا ہائے سو بھی اک عمر میں ہوا معلوم

اسی مضمون کو فانی نے کہا ہے:۔

حاصل علم بشر جہل کا عرفاں ہونا عمر بھر عقل سے سیکھا کئے ناداں ہونا

(۳) خواجہ نظیری کا شعر ہے:۔

بنیاد ما خرابیِ ما استوار کرد گوئی کہ سود ماست نظیری زیان ما

نظیری کا مطلب یہ ہے کہ ہستی ہی نیستی کی بنیاد ہے اور وجود سے ہی عدم پیدا ہوتا ہے اس لئے جس کو تو میرا فایدہ سمجھتا ہے وہ حقیقت میں میرا نقصان ہے۔ غالب کہتا ہے:۔

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

غالب کا مطلب یہ ہے کہ ہستی کے کتم عدم سے عالم وجود میں آنے سے پہلے صرف ذات باری تعالیٰ ہی تھی اور بعد میں کائنات کی تخلیق جو کچھ ہوئی وہ بھی اسی ذات کا جزو ہے۔ مولانا حالی مرحوم یادگار غالب میں اس شعر کے متعلق لکھتے ہیں: "بالکل نئی طرح سے نیستی کو ہستی پر ترجیح دی ہے اور ایک عجیب توقع پر معدوم محض ہونے کی تمنا کی ہے۔ پہلے مصرع کے معنی ظاہر ہیں۔ دوسرے مصرعہ سے بظاہر یہ مفہوم ہوتا ہے کہ اگر میں نہ ہوتا تو کیا برائی ہوتی مگر قایل کا مقصود یہ ہے کہ میں نہ ہوتا تو دیکھنا چاہئے کہ میں کیا چیز ہوتا۔ مطلب یہ ہے کہ خدا ہوتا کیونکہ پہلے مصرعہ میں بیان ہو چکا ہے کہ اگر کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا"۔ غالب نے جو تصریح کی ہے اس کی روشنی میں نظیری کے شعر کو دیکھنا چاہئے لیکن اس میں شک نہیں ہے کہ غالب نے اس مضمون کو اس شعر میں انتہائی بلندی تک پہونچا دیا ہے۔ غالب کا دوسرا شعر اسی مضمون کا ہے جس کو نظیری نے پیش کیا ہے۔

میری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی ہیولے برق خرمن کا ہے خون گرم دہقاں کا

غالب کے اس شعر کا پہلا مصرعہ نظیری کے پہلے مصرعہ کا ترجمہ ہے۔ لیکن دوسرے مصرعہ میں دونوں کے درمیان بہت فرق ہے۔

فانی کہتا ہے: تعمیر آشیاں کی ہوس کا ہے نام برق جب ہم نے کوئی شاخ چنی شاخ جل گئی

فانی کے اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے کہ نظیری اور غالب دونوں سے استفادہ کیا ہے، کیونکہ پہلا مصرعہ غالب کے پہلے مصرعہ سے ماخوذ ہے اور فانی کا دوسرا مصرعہ نظیری کے طرز پر ہے لیکن فانی کے یہاں شعریت نظیری سے بھی زیادہ ہے یہاں سود و زیاں کے ذکر کے بجائے اس شاخ کے جل جانے کا ذکر ہے جو تعمیر آشیاں کے لئے منتخب کی جائے۔ اس کے علاوہ نظیری اور غالب کی نسبت فانی کے شعر کے دونوں مصرعے زیادہ مربوط ہیں۔ نظیری اور غالب کے اشعار میں فانی نے اضافہ کیا ہے۔

(۴) دقیقی کی ایک رباعی ہے: گویند صبر کن کہ ترا صبر بر دہد آرے دہد ولیک بعمر دگر دہد

من عمر خویشتن بصبوری گزاشتم عمر دگر بباید تا صبر بر دہد

یعنی یہ جو کہا گیا کہ صبر کا پھل میٹھا ہے صحیح تو ہے مگر بات یہ ہے کہ یہ دوسری عمر میں جا کر پھل دیتا ہے کیونکہ میں نے تو ساری عمر صبر میں گزار دی۔ اب صبر کا پھل پانے کے لئے دوسری عمر درکار ہے۔ خواجہ حافظ نے بھی اس مضمون کو کہا ہے :۔

گوہر سنگ لعل شود در مقام صبر　　آرے شود ولیک بخون جگر شود

خواجہ حافظ نے دقیقی کے مضمون میں ندرت پیدا کر دی ہے اور صبر کا اصل فلسفہ بھی اس کے ساتھ ہی پیش کر دیا ہے یعنی یہ جو کہا گیا کہ صبر کی صفت یہ ہے کہ اس کی بدولت معمولی پتھر لعل ہو جاتا ہے ٹھیک ہے مگر یہ مرتبہ جگر کو خون کر دینے کے بعد حاصل ہوتا ہے۔

(۵) شیخ سعدی کا شعر ہے :۔ ہر کہ باز آید ز در پندارم اوست　　تشنہ مسکیں آب پندارد سراب

سعدی نے ایک نفسیاتی اصول کی شاعرانہ وضاحت کی ہے کہ عاشقِ مسکیں دیدار محبوب کے لئے ترس رہا ہے اس لئے جب بھی کوئی دروازہ سے داخل ہوتا ہے اسے اپنے محبوب کا ہی دھوکہ ہوتا ہے۔ مصرعہ ثانی نے مضمون میں جلا پیدا کر دی۔ اسی مضمون سے مولانا جامی نے دوسری ہی بات پیدا کی ہے وہ اس کو تصوف میں لے گئے ہیں۔ فرماتے ہیں :۔

بس کہ در جان نگارو چشم بیدارم توئی،　　ہر کہ پیدا می شود از در پندارم توئی

مولانا نے اپنے عشق کے اظہار کے ساتھ وحدت شہود کے مسئلہ کو بھی پیش کر دیا ہے اور سعدی کے یہاں جو مضمون محض عشق مجازی کی شکل میں تھا اس کو مولانا جامی نے خالص تصوف سے متعلق کر دیا ہے اور سعدی کے مضمون میں یہ ایک عمدہ اضافہ ہے اس شعر کے متعلق یہ لطیفہ آزاد نے آبِ حیات میں لکھا ہے کہ مولانا جامی حالت وجد میں اپنا یہی شعر بار بار پڑھ رہے تھے کسی نے آہستہ سے کہا کہ "اگر خر پیدا می شود" مولانا نے برجستہ جواب دیا کہ "پندارم توئی"۔ اس کے بعد آزاد نے خواجہ میر درد کا یہ شعر لکھا ہے :۔

بیگانہ گر نظر پڑے تو آشنا کو دیکھ　　بندہ گر آئے سامنے تو بھی خدا کو دیکھ

(۶) مولانا عراقی کہتے ہیں :۔ راز یست دریں پردہ گر آں را بشناسی　　دانی کہ حقیقت زچہ در بند مجاز ست

عراقی صرف اتنا بتاتے ہیں کہ کائنات کے اندر جو کچھ بھی راز ہے وہ وہی ہے جو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے ہم مجاز کو ہی دیکھ سکتے ہیں اور اس مجاز ہی میں حقیقت موجود ہے۔ اسی مضمون کو عرفی نے کہا ہے :۔

ہر کس نشناسندۂ راز ست دگر نہ　　ایں ہا ہمہ راز ست کہ معلوم عوام ست

عرفی نے بات کو اور زیادہ صاف کر دیا کہ جس راز کی جستجو ہے وہ تو عوام تک جانتے ہیں۔ گویا عراقی کی زبان میں ہر مجاز کے اندر حقیقت پوشیدہ ہے، عرفی کہتا ہے کہ اس حقیقت کو ہر شخص جانتا ہے لیکن یہ بات سمجھ لینا ہر شخص کے بس میں نہیں ہے کہ کائنات کا اصلی راز یہی ہے۔ عراقی نے حقیقت اور مجاز کے پردہ میں جو بات کہی تھی اس کو عرفی نے صرف معمولی الفاظ میں ادا کر دیا ہے اور مضمون میں بھی ایک قدم آگے بڑھایا ہے اسی مضمون کو مرزا غالب نے کہا ہے :　محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا　　یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

اس شعر کی تشریح مولانا حالی یادگار غالب میں اس طرح فرماتے ہیں کہ "راز کے نغموں سے تو خود ہی ناآشنا ہے ورنہ دنیا میں جو بظاہر حجاب نظر آتے ہیں وہ بھی پردۂ ساز کی طرح بول اور بج رہے ہیں اور اسرار الٰہی ظاہر کر رہے ہیں" (کتاب مذکور ص۱۳۵) غالب کا مطلب یہ ہے کہ ہم جس حجاب کو راز قرار دے رہے ہیں دراصل وہ حجاب ہی اس راز کی پردہ دری کرنے کا باعث ہیں وہ پردہ ایک پردہ ساز ہے جسمیں نواہائے راز کے علاوہ کچھ نہیں ہے اپنے آپ کو محرم بنانے کی کوشش کرنا چاہئے کہ ان نواہائے راز سے متاثر ہو سکے۔

(۷) خواجہ حافظ کا شعر ہے : در رہ عشق نشد کس بیقیں محرم راز　　ہر کسے بر حسب فہم گمانے دارد

خواجہ حافظ کا مقصد یہ ہے کہ عشق ایک ایسی پیچیدہ اور لاینحل چیز ہے کہ کوئی شخص بھی اس کے متعلق درجۂ یقین تک نہیں پہونچ سکتا کہ جو رائے وہ رکھتا ہے وہ صحیح ہے جو کچھ بھی کوئی ایک شخص کہتا ہے وہ صرف اس کا گمان ہوتا ہے جو اس کی عقل کے مطابق ہے۔

نظیری کہتا ہے :　تا بکے فکر تواں کرد و سخن تازہ نوشت　　قصۂ شوق حدیثے ست کہ پایانش نیست

خواجہ حافظ نے مسایل و منازل عشق کے متعلق کہا تھا کہ ان کی غایت و کنہ دریافت نہیں ہو سکتی لیکن نظیری نے اُسی مضمون سے دوسری ہی بات پیدا کی ہے کہ شوق کی منازل کی کوئی انتہا ہی نہیں ہے۔

نظیری کا دوسرا شعر ہے:- چندیں سخن عشق کہ گفتند و شنیدند، کس حق محبت نتوانست ادا کرد

یہ بالکل وہی مضمون ہے جو خواجہ حافظ نے کہا ہے اور اُسی مضمون کو دوسری طرح ادا کیا ہے اور خواجہ کے اجمال کی تفصیل کر دی ہے۔ جگر مراد آبادی کا شعر ہے:-

کوئی حد ہی نہیں شاید محبت کے فسانے کی سنا تا جا رہا ہے جس کو جتنا یاد ہوتا ہے

یہ شعر خواجہ حافظ اور نظیری کے پہلے شعر سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے مگر حافظ اور نظیری کے دونوں مصرعوں نے ملکر اس شعر میں نیا لطف پیدا کر دیا ہے

(۸) مولانا حالی مرحوم مقدمہ شعر و شاعری میں تحریر فرماتے ہیں کہ "ایک روز خواجہ حافظ کا یہ شعر:

شبے تاریک و بیم موج و گردابے چنیں حایل کجا دانند حال ما سبکساران ساحلہا

ایک موقع پر پڑھا گیا۔ ایک صاحب جو شعر کا صحیح مذاق رکھتے تھے یہ شعر سن کر بولے "کاش دوسرے مصرعہ میں بھی اسی قسم کی مشکلات اور سختیوں کا بیان ہوتا جیسی کہ پہلے مصرعہ میں بیان کی گئی ہیں اور اس بات کا کچھ اظہار نہ کیا جاتا کہ بیدردوں کو ہمارے حال کی کیا خبر ہے تاکہ اپنے حال میں مبتلا رہنے اور غیر کے تصور سے ذہول ہونے کا زیادہ ثبوت ہوتا" میں نے غالب مرحوم کا یہ شعر پڑھا:

ہوا مخالف و شب تار و بحر طوفاں خیز گسستہ لنگر کشتی و ناخدا خفتست

وہ یہ شعر سنکر پھڑک گئے اور کہا کہ ہاں بس یہی میرا مطلب تھا"

مولانا حالی نے خواجہ حافظ کے اس شعر کا ماخذ شیخ سعدی کے اس شعر کو قرار دیا ہے کہ:-

از ورطۂ ما خبرے ندارد آسودہ کہ بر کنارِ ریاست

حقیقت میں حافظ اور سعدی کا مفہوم ایک ہی ہے، لیکن حافظ نے اس مضمون اور تمثیل کو انتہا تک پہونچا دیا ہے جس کی ابتدا شیخ سعدی نے کی تھی۔ شیخ کے یہاں صرف ایک لفظ "ورطہ" تھا حافظ نے پہلے مصرعہ میں اس کی پوری تشریح کر دی اور شیخ نے صرف "آسودہ" کا لفظ استعمال کیا تھا۔ حافظ نے "سبکساران ساحل" سے اس کی مکمل تضمین کر دی۔ لیکن غالب کے "ناخدا خفتست" نے سعدی و حافظ کے مضمون کو اپنی جگہ قایم رکھنے کے ساتھ ہی معنی میں اتنی وسعت و لطافت پیدا کر دی ہے کہ اس کا جواب نہیں ہو سکتا۔ اسی مضمون کو نظیری نے دوسرے پیرایہ میں ادا کیا ہے:-

ز زیر شاخ گل افعی گزیدہ بلبل را نوا گران نخوردہ گزند را چہ خبر

خواجہ حافظ نے جس بات کو بلیغ ترین پیرایہ میں بیان کیا تھا نظیری اس میں مطلق اضافہ نہ کر سکا۔ حافظ کا شعر اپنے مفہوم کے اعتبار سے بالکل صاف ہے اور نظیری کے یہاں اتنی صفائی نہیں ہے۔ جس طرح حافظ کے شعر کی جان "سبکساران ساحل" کی نادر ترکیب ہے اسی طرح نظیری نے "نوا گران نخوردہ گزند" کی ترکیب پر اپنے شعر کی عمارت قایم کی ہے مگر دونوں کا تفاوت ظاہر ہے۔ حافظ نے اپنے مصائب کے ذکر کے بعد ساحل کے بیدرد تن آسانوں کو عمومیت کے ساتھ پیش کیا ہے اور نظیری نے "نخوردہ گزند" سے اُس لطافت اور عمومیت کو کھو دیا۔ اگر نخوردہ گزند کے بجائے کوئی ایسا لفظ یہاں موجود ہوتا جو نوا گری کے ساتھ ان کی تن آسانی وغیرہ کو ظاہر کرتا تو شعر زیادہ لطیف ہو جاتا۔

اِن مثالوں سے اِس امر کو واضح کرنا مقصود تھا کہ متقدمین سے استفادہ کرنے کی وجہ سے ہی متاخرین بعض نازک اور عمدہ مضامین پیدا کر سکے اگر متقدمین سے استفادہ کرنا سرقہ سمجھ کر ترک کر دیا جائے تو ان تمام فوایدسے دست بردار ہونا پڑے گا۔

(باقی)

عزیز حسن

تاریخ یونان کا ایک پوشیدہ ورق

(سکندر اعظم کی تخت نشینی کی خونیں داستان)

مسیح سے چار سو سال سے قبل جزیرۂ ساسوتھراس، یونان کا بڑا مشہور و مقدس جزیرہ سمجھا جاتا تھا، یہاں پہاڑ کی چوٹی پر جو سطح آب سے ۵ ہزار فٹ بلند تھی، آمون یا زیوس دیوتا کا ایک نہایت خوبصورت و شاندار معبد قایم تھا جہاں جنسی اختلاط کی حد درجہ بیباک و شہوت انگیز رسمیں ادا کی جاتی تھیں۔

ان مراسم مذہبی کی دو صورتیں تھیں ایک عوام کے لئے مخصوص تھیں دوسری خواص کے لئے۔ طبقۂ خواص کے بھی دو درجے تھے جن میں ایک درجہ صرف کاہنوں، شاہزادوں اور شاہزادیوں کے لئے مخصوص تھا۔

ہر شخص جو اس کے اندر داخل ہونا چاہتا تھا پہلے اس سے حلف لیا جاتا تھا کہ وہ یہاں کے راز کسی پر ظاہر نہ کرے گا اور جب حلف لیکر وہ ایک بار اندر داخل ہو جاتا تھا تو اس کے معنے یہ تھے کہ وہ ایسی دنیا میں پہونچ گیا ہے جہاں شرم و حجاب، عفت و عصمت کا کوئی مفہوم نہیں ہے اور انسان جانوروں کی طرح جنسی اختلاط کے لئے آزاد ہے۔

معبد کے اندرونی حصہ کے بھی تین درجے تھے، ایک مردوں کے لئے، دوسرا عورتوں کے لئے اور تیسرا نوجوان لڑکوں، لڑکیوں کے لئے اور ٹھیک اس وقت جبکہ قحاشی اپنی انتہائی شہوت انگیز حد تک پہونچ جاتی، سب پردے اٹھا دئے جاتے تھے، پھر تینوں درجے کے مرد و عورت، لڑکوں اور لڑکیوں کو پوری آزادی حاصل تھی کہ جو چاہیں سو کریں۔

مسیح سے ٹھیک ۳۵۸ سال قبل انھیں مراسم شہوت پرستی کے زمانہ میں ایک دن مقدونیہ کا نوجوان بادشاہ فلپس یہاں پہونچا اور ایک نہایت حسین رقاصہ پر عاشق ہو گیا۔

اس کا نام "اولمپیاس" تھا جس نے اپنا حسن و جمال، اپنی رعنائی و دلکشی اور روح و جسم سب معبد آمون کی لذت پرستیوں اور شہوت رانیوں کے لئے وقف کر دیا تھا۔

معبد آمون شمعوں اور قندیلوں کی روشنی سے جگمگا رہا ہے اور المپیاس عریاں رقص کے ذریعہ سے اپنے سڈول اور خوبصورت جسم کے ایک ایک عضو کی شہوت انگیز نمایش میں محو ہے۔ اس کے مرمری جسم کے لوچ اور لچک کا یہ عالم ہے گویا ایک زریں موج ہے جو فضا میں ہچکولے کھا رہی ہے وہ اپنے ہاتھ میں ایک عصا لئے ہوئے ہے جو پھولوں سے آراستہ ہے اس پر ایک سانپ لپٹا ہوا ہے جو رقص کے دوران میں کبھی اولمپیاس کے سینے کو حلقہ میں لے لیتا ہے اور کبھی اس کی کمر اور گردن کو۔

وہ اپنے رقص کے انتہائی عروج پر ہے کہ فلپس اندر داخل ہوتا ہے اور اس کو دیکھتے ہی فریفتہ ہو جاتا ہے۔ فلپس اس کے چچا بادشاہ ایپروس کے پاس شادی کا پیغام بھیجتا ہے اور آخرکار دونوں درباروں میں جشن عروسی کی طیاریاں شروع ہو جاتی ہیں۔

جوں جوں شادی کے دن قریب ہوتے جاتے ہیں، معبد آمون کی پرستش گاہ میں اس کے رقص کی مستیاں اور رقص کے ساتھ ہر ایک شباب

کی ارزانیاں بڑھتی جاتی ہیں، یہاں تک کہ شادی کی رات آپہونچی اور اس نے ایک خواب دیکھا کہ
ہوا طوفانی ہے اور بجلی چمک رہی ہے کہ دفعتاً ایک خوفناک گرج کے ساتھ بجلی اس کے جسم سے مس کرتی ہے اور اس کی ناف سے ایک
شعلہ نکل کر فضا میں بلند ہوتا ہے اور پھر اس سے بہت سی شاخیں نکل کر چاروں طرف افق میں پھیل جاتی ہیں۔

اُدھر فلپس بھی شادی کی طیاری میں مصروف ہے اور بے اندازہ دولت صرف ہو رہی ہے۔ پلوٹارک کا بیان ہے کہ فلپس اپنی فضول خرچی کے لحاظ سے بہت مشہور تھا اور وہ اپنی آمدنی و خرچ کا حساب کبھی کبھی نہ رکھتا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسے بادشاہ نے اپنی شادی کی طیاری میں کیا کچھ نہ کیا ہوگا، خزانہ کا دروازہ کھول دیا گیا تھا، اشرفیاں پانی کی طرح بہ رہی تھیں اور اس نے حکم دیا تھا کہ جشن عروسی ایسے غیر معمولی پیمانہ پر منایا جائے کہ تاریخ عالم میں اس کی نظیر نہ مل سکے۔ آخر کار شادی کا دن آپہونچا اور یہ رسم بھی ادا ہو گئی۔

شب زفاف کے ایک روز بعد فلپس نے خواب دیکھا کہ اس نے اپنی دُلھن کے اندام خاص پر مُہر لگا دی اور مُہر کا نقش ایک شیر کی صورت کا ہے۔ کاہنوں اور نجومیوں نے اولمپیاس اور فلپس دونوں کے خواب سامنے رکھ کر یہ تعبیر دی کہ اولمپیاس کا بجلی کو خواب میں دیکھنا تو یہ ظاہر کرتا ہے کہ خداوند آمون کو اس عقد سے خاص دلچسپی تھی، لیکن شعلہ کا اس کی ناف سے نکل کر چاروں طرف فضا میں پھیل جانا یہ ظاہر کرتا ہے کہ اولمپیاس کے بطن سے ایک لڑکا پیدا ہوگا جو تمام عالم کو فتح کرلے گا۔ فلپس کا خواب میں یہ دیکھنا کہ اس نے اولمپیاس کے جسم پر مہر لگا دی ہے، اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ اولمپیاس حاملہ ہو گئی ہے اور اس کے بطن سے شیر کا سا دل رکھنے والا لڑکا پیدا ہوگا۔

اس تعبیر کو سنکر سب کو بڑی مسرت ہوئی اور میاں بیوی دونوں بڑے لطف کی زندگی بسر کرنے لگے۔ لیکن ایک خاص واقعہ نے حالات کا رخ بدل دیا اور یہ تمام مسرتیں خاک میں مل گئیں۔

فلپس کو اس کا بالکل علم نہ تھا کہ اولمپیاس نے ایک سانپ پال رکھا ہے جس سے وہ بہت مانوس ہے۔ اور سمجھتی ہے کہ خداوند آمون اسی سانپ کے بھیس میں اس سے اختلاط کرتا رہتا ہے۔

ایک رات فلپس ناگاہ اس کی خوابگاہ میں پہونچا تو دیکھا کہ اولمپیاس عریاں لیٹی ہوئی ہے اور سانپ سے محو اختلاط ہے۔

فلپس یہ دیکھ کر سکتہ میں رہ گیا اور ہنوز اس کی یہ حالت دور نہ ہوئی تھی کہ اولمپیاس اُٹھ کھڑی ہوئی اور اس نے حد درجہ برہمی کے ساتھ فلپس کو ڈانٹا کہ وہ کیوں بغیر اجازت اس کی خواب گاہ میں آگیا اور خداوند آمون کے اختلاط میں حایل ہوا۔

فلپس کی پرورش بھی چونکہ یونان کی اسی اساطیری فضا میں ہوئی تھی اس لئے وہ بھی ڈر گیا اور واپس چلا آیا، لیکن بعد کو جب یہ مذہبی تاثر کم ہوا تو اس نے سوچا کہ خداوند آمون کا سانپ کے بھیس میں رہنا کوئی معنی نہیں رکھتا اور جب اسے اولمپیاس کی بدمستی کا خیال آیا جو سانپ کے ساتھ اختلاط کرنے کے دوران میں اس سے ظاہر ہو رہی تھی تو اس کو یقین ہو گیا کہ یہ سب فریب ہے اور اولمپیاس اس کو دھوکا دیتی ہے۔ آخر کار اس نے کہدیا کہ اولمپیاس کے شکم میں جو بچہ پایا جاتا ہے وہ اس کے نطفہ سے نہیں ہے بلکہ کسی اور کا ہے جس سے اولمپیاس کا خفیہ تعلق ہے۔

فلپس پر ان واقعات کا بہت گہرا اثر ہوا، یہاں تک کہ اسے اولمپیاس سے نفرت ہو گئی اور اپنا دل بہلانے کے لئے اپنے فوجی افسروں کے ساتھ وہ زیادہ تر ملک کے دورہ پر باہر رہنے لگا۔

۳۵۶ ق۔م میں، جبکہ وہ پایۂ تخت سے باہر ہی تھا، اسے معلوم ہوا کہ اولمپیاس کے لڑکا پیدا ہوا ہے اور اس کا نام اس نے سکندر رکھا ہے، لیکن وہ واپس نہ آیا اور بدستور سیر و سیاحت میں مصروف رہا۔ یہاں تک کہ دو سال گزر گئے اور فلپس بدستور باہر ہی رہا، لیکن اولمپیاس کو بھی اس کی پروا نہ تھی کیونکہ اس کا سارا وقت سکندر کی نگہداشت میں صرف ہوتا تھا جسے وہ خداوند آمون کا عطیہ سمجھتی تھی۔

جب دو سال کے بعد فلپس پایۂ تخت میں واپس آیا اور اس کی نگاہ اولمپیاس پر پڑی تو اس کا دل پھر اس کی طرف کھنچنے لگا اور رفتہ رفتہ وہی اگلا سا جوش محبت پھر عود کر آیا۔ لیکن چند دن بعد سکندر کے مسئلۂ تعلیم و تربیت نے پھر دونوں میں اختلاف پیدا کر دیا۔ اولمپیاس کہتی تھی کہ اس کی تعلیم بالکل مذہبی ہونا چاہیئے تاکہ وہ بڑا ہو کر کاہن بنے اور معبد آمون کے لئے اپنی زندگی وقف کر دے، فلپس کا اصرار تھا کہ وہ ایک شاہزادہ کی سی تعلیم حاصل کرے جسے آگے چل کر بادشاہ ہونا اور ملک کا انتظام کرنا ہے چونکہ اولمپیاس کا اثر اپنے بیٹے پر زیادہ تھا اور فلپس سکندر کو اس سے جدا نہ کر سکتا تھا، اس لئے آخر کار وہی ہوا جو اس کی ماں چاہتی تھی اور سکندر کی تعلیم صرف مذہب اور فلسفہ تک محدود رہی۔ لیکن کچھ دن بعد اولمپیاس نے سوچا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مذہبی تعلیم اسے دنیا و ما فیہا کی طرف سے بالکل متنفر کر دے، اس لئے اس نے سکندر کو لہو و نشاط کی جانب مائل کرنے کے لئے خوبصورت لڑکیاں اس کی صحبت کے لئے متعین کیں جو ہر وقت جلوت و خلوت میں اسکو گھیرے رکھتیں، لیکن سکندر زندگی کے ان اسرار سے واقف نہ ہوا جن کا انکشاف وہ اپنے بیٹے پر کرنا چاہتی تھی۔ سکندر ہمیشہ لڑکیوں سے الگ الگ رہتا اور جب وہ اس کی خوابگاہ میں پہونچ جاتیں تو وہاں سے باہر نکل بھاگتا۔

گو فلپس کی عمر اس وقت ۴۶ سال کی ہو چلی تھی، لیکن اس کی صحت و توانائی میں کوئی فرق نہ آیا تھا اس لئے اب جو وہ لڑائیوں سے فارغ ہو کر اطمینان سے بیٹھا اور دربار کی عشرتوں کی طرف متوجہ ہوا تو اس کی تمام وہی خواہشات پھر عود کر آئیں جو اولمپیاس کے دیکھنے کے بعد عنفوان شباب میں اس کے دل میں پیدا ہوئی تھیں — اس کا یہ میلان دیکھ کر ملک کی جمیل ترین لڑکیاں دربار میں آ آ کر شریک ہونے لگیں اور آخر کار فلپس ایک سردار کی نہایت خوبصورت لڑکی پر جس کا نام کلیوپیٹرا تھا، فریفتہ ہو گیا۔ یہ لڑکی جتنی حسین تھی اتنی ہی جاہ طلب تھی اس لئے اس نے کہدیا کہ میں شادی اسی وقت کروں گی جب اولمپیاس کو طلاق دیدی جائے۔ اسی کے ساتھ اس نے فلپس سے یہ بھی کہا کہ اولمپیاس کہتی ہے سکندر فلپس کا بیٹا بھی نہیں ہے بلکہ خداوند آمون کا ہے، اور اس صورت میں وہ ولی عہد بھی نہیں قرار پا سکتا۔

فلپس نے ان تمام باتوں کا یقین کر کے اولمپیاس کو طلاق دیدی اور اس کی جگہ کلیوپیٹرا کے ملکہ ہونے کا اعلان کر دیا۔ اولمپیاس اور سکندر نے بہت کچھ کہا لیکن فلپس نہ مانا اور اس نے حکم دیا کہ اولمپیاس اور سکندر بھی شادی کی رسم میں حصہ لیں۔ شب عروسی کا جشن پورے اہتمام کے ساتھ منایا جا رہا ہے، تمام امراء و سردار جمع ہیں، خم کے خم شراب کے لنڈھائے جا رہے ہیں اور ہر شخص بدمست نظر آ رہا ہے۔ اسی عالم میں کلیوپیٹرا کے چچا آلمپس شراب کا گلاس اٹھایا اور بادشاہ کا جام صحت نوش کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ "اب مقدونیہ کو ایک حلالی ولی عہد کے ملنے کی امید ہو گئی ہے"۔ سکندر بہت برہم ہوا اور اپنی جگہ سے اٹھکر بولا کہ "اے نمک حرام تجھے اتنی ہمت ہو گئی کہ میرے ہی سامنے مجھے حرامی کہتا ہے" اور یہ کہکر جام شراب اس کے منہ پر کھینچ مارا۔ فلپس یہ دیکھ کر بہت برہم ہوا اور وہ ہاتھ میں تلوار لیکر سکندر کی طرف بڑھا لیکن چونکہ نشہ میں چور تھا اسلئے لڑکھڑا کر گرا۔ سکندر نے یہ دیکھ کر باپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ "یہ شخص سارے ایشیا کو فتح کرنا چاہتا ہے اور اس میں اتنی قدرت بھی نہیں کہ اٹھکر میری میز تک آ سکے"۔ یہ کہکر وہ دربار سے نکل گیا اور اپنی ماں کو ساتھ لیکر اولمپیاس کے چچا بادشاہ اپیروس کے دربار میں جا کر پناہ لی۔

ایک سال کے بعد فلپس کی دوسری بیوی سے لڑکا پیدا ہوا، لیکن بجائے اس کے کہ امراء و رعیان خوش ہوتے، ان کو فکر پیدا ہو گئی کہ اب جانشینی کا مسئلہ کیونکر طے ہوگا اور ممکن ہے اس اختلاف کی وجہ سے خانہ جنگی شروع ہو جائے اور ملک تباہ ہو۔ لیکن قدرت نے اس کا فیصلہ یوں کر دیا کہ ایک دن فلپس دربار میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک شخص پارسانیاس نامی نے اس کے قلب میں خنجر پیوست کر دیا اور وہ اسی وقت ہلاک ہو گیا دربار کے امیر نے جو اولمپیاس کا طرفدار تھا اس واقعہ کی خبر اولمپیاس کو پہونچا دی اور جب تک وہ آئے انتظام سلطنت اپنے ہاتھ میں لیکر سب سے پہلے کلیوپیٹرا کو گرفتار کر لیا اور اس سے کہا کہ یا تو وہ خودکشی کرے یا ذلت کے ساتھ وہ سولی پر جان دینے کے لئے طیار رہے۔ کلیوپیٹرا پر جو ابھی زچہ خانہ ہی میں تھی اس درجہ خوف طاری ہوا کہ اسی رات اس نے اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالا، لیکن اولمپیاس کے انتقام کا جذبہ ٹھنڈا نہ ہوا، اور اس نے کلیوپیٹرا کے نوزائیدہ بچہ کو بھی ختم کر دینے کا فیصلہ کر لیا۔ معبد آمون میں مجسمۂ آمون کے برابر ہی اس بڑے آتش دان کے گرد جو شب و روز روشن رہتا تھا، کاہن جمع ہیں اور مذہبی نغموں سے فضا گونج رہی ہے کہ اولمپیاس دفعتہً رقص کرتے ہوئی نمودار ہوتی ہے اور حکم دیتی ہے کہ آمون کی قربانی سامنے لائی جائے۔ رئیس معبد کلیوپیٹرا کے بچہ کو اپنے ہاتھوں پر اٹھا لیتا ہے اور اسے آتشدان کے بھڑکتے ہوئے شعلوں میں پھینک دیتا ہے۔

قوتِ متخیلہ اور روحانی تصورات

قوتِ متخیلہ کے نتائج ہمیں تقریباً ہر انسان میں ملتے ہیں۔ کسی میں کم کسی میں زیادہ۔ جس شخص کے اندر اس قوت کی بہتات ہوتی ہے وہ شاعر، ادیب، سائنسداں یا اعلیٰ درجہ کا مصور بن جاتا ہے اور جس میں اس کی کمی ہوتی ہے وہ تخلیقی کام کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ بہرحال تخلیقی اہلیت کے لئے طاقت ور قوتِ متخیلہ کا پایا جانا بہت ضروری ہے۔ لیکن یہ پتا لگانا کہ کس انسان کے اندر قوتِ تخیل زیادہ ہے اور کس میں کم، ذرا مشکل کام ہے یوں تو غیر معمولی حالات میں ہم بآسانی کہہ سکتے ہیں کہ فلاں فلاں دو اشخاص میں بہ اعتبار قوتِ تخیل کس کی شخصیت بلند ہے لیکن اگر بیک وقت ہمارے سامنے دس پندرہ آدمی لائے جائیں اور جلد سے جلد یہ فیصلہ کرنا ہو تو بلا نفسیاتی تجربات کے ہم فیصلہ کرنے میں ناکام رہیں گے۔

قوتِ متخیلہ کا اظہار بالعموم اس وقت ہوتا ہے، جب ہمارے ذہن میں ایک کے بعد دوسری تصویر آتی رہتی ہے یہاں تک کہ پورے پورے واقعات دماغ کے سامنے اس طرح آجاتے ہیں جیسے سینما کے پردے پر کسی واقعہ کی تصویر ہے لیکن یہ کیفیت ہمارے احساسات کے متحرک ہونے کے بعد ہی پیدا ہو سکتی ہے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے ۱۸۹۵ء میں پروفیسر بینٹ اور مسٹری نے قوتِ متخیلہ کے تجربات شروع کئے تھے، لیکن ان تجربات کو معیاری صورت دینے کا کام پروفیسر وھپل (Prof. Whipple) کے ہاتھوں انجام پایا۔ پروفیسر مذکور نے ۲۰ کارڈ ایسے تیار کئے جن پر روشنائی کے چھوٹے بڑے دھبے پڑے ہوئے تھے۔ ان کارڈوں کو استعمال کرنے کا ایک طریقہ یہ تھا کہ ایک شخص کو یہ سارے کارڈ دے دئے جاتے تھے اور وہ ہر کارڈ کے دھبے کو دیکھ کر جو خیال ذہن میں آتا تھا نوٹ کرتا جاتا تھا اور اس طرح متعدد افراد کے خیالات کا موازنہ کر کے ان کی تخئیل کی رسائی کے متعلق رائے قایم کی جاتی تھی۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ سارے کارڈ ایک شخص کے سامنے میز پر رکھے جاتے تھے اور ہدایت کر دی جاتی تھی کہ جوں ہی ایک کارڈ کھولا جائے وہ اس کے متعلق سوچنا شروع کرے اور جس وقت دھبوں کی شکل سے ملتی جلتی کسی تصویر کا اسے احساس ہو وہ میز پر ہاتھ مار کر یا "یہ رہی" کہکر اس حقیقت کا انکشاف کرے۔ ساتھ ہی ساتھ تجربہ کرنے والے کا فرض یہ تھا کہ وہ اسٹاپ واچ "بند گھڑی" کی مدد سے کارڈ کے کھلنے اور میز پر ہاتھ مارنے کے درمیانی وقفہ کو نوٹ کرے۔ اسی طرح ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا، غرضکہ بیسوں کارڈ کھولے جاتے تھے اور ہر دفعہ وقت نوٹ کر لیا جاتا تھا۔ اس طرح پہلے طریقے میں قوتِ تخیل کا اندازہ تصاویر کی زیادتی اور کمی کے اعتبار سے کیا جاتا تھا اور دوسرے طریقے میں وقت کی کمی اور زیادتی پر تخئیل کی بلندی اور پستی کا پتہ لگایا جاتا تھا۔

اس طریقہ کے علاوہ بھی قوتِ متخیلہ پر اور مختلف طریقوں سے تجربات کئے جا سکتے ہیں۔ مثلاً ایک طریقہ جس کا موجد مسیلن (Masselon) ہے یہ ہے کہ معمول کو تین الفاظ دے دئے جاتے ہیں اور اسکو یہ ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ پانچ منٹ کے اندر جس قدر بامعنی جملے ان تینوں الفاظ سے بن سکے بنائے۔ یہی عمل بیک وقت بہت سے لوگوں پر کیا جاتا ہے اور آخر میں جس کے جملے سب سے زیادہ اور بامعنی ہوتے ہیں اس کو سب سے زیادہ نمبر دئے جاتے ہیں۔ لیکن اس طریقے میں ایک خرابی یہ ہے کہ قوتِ متخیلہ کا مقداری تعین تو یقیناً جملوں کی طویل قطار سے ہو جاتا ہے لیکن جہاں تک جملوں کی گہرائی اور عمق کا سوال ہے یہ مسئلہ غیر تصفیہ شدہ ہی رہ جاتا ہے پروفیسر بنٹ (Binet) نے تخیل کی شدت اور گہرائی کا اندازہ لگانے کے لئے اس سے بہتر طریقہ ایجاد کیا، اس ماہر نفسیات کا یہ طریقہ تھا کہ وہ معمول کو ایک جملے کے ابتدائی دو الفاظ دے دیتا تھا اور بقیہ خالی جگہ کو پُر کرنے کی ہدایت کرتا تھا

اور بقیہ خالی جگہ کو پُر کرنے کی ہدایت کرتا تھا اس طرح مختلف افراد کے جملوں سے اُس کی دماغی کیفیت کا اظہار ہوتا تھا۔ مثلاً بعض زیادہ پڑھے لکھے لوگ انھیں دو الفاظ سے انتہائی پُر شوکت اور فلسفیانہ طرز فکر کا اظہار کرتے تھے اور دوسرے کند ذہن اور غبی حضرات بالکل سیدھے اور بھدے جملوں پر اکتفا کرتے تھے۔ غرضکہ جملوں پر غور کرنے سے ان کی انفرادی خصوصیات کا پتہ لگ جاتا تھا۔ جہاں تک تخیل کی تیزی کا سوال تھا اس کا فیصلہ اس طرح ہوتا تھا کہ جس وقت جملے کے الفاظ دئے جاتے تھے صحیح وقت نوٹ کر لیا جاتا تھا اور گھڑی اس وقت تک چلتی رہتی تھی جب تک کہ جملہ پورا نہ ہو جائے اور اس طرح مختلف لوگوں کے نتائج پر غور کرنے سے اُن کی انفرادی تفریق کا پتہ چل جاتا تھا۔

ان تجربات کے علاوہ بھی ماہرین نے مختلف تجربات کئے ہیں۔ چنانچہ ایک مشہور طریقہ جو اکثر ہمارے نیچے درجوں کے امتحانات میں برتا جاتا ہے یہ تھا کہ نثر کا ایک فقرہ جس میں چند الفاظ کی جگہ خالی رہتی ہے لڑکے کو دیا جاتا تھا اور جتنا وقت وہ خالی جگہوں کو پُر کرنے میں صرف کرتا تھا نوٹ کر لیا جاتا تھا۔ دوسرے طریقے کی رو سے جو بالکل اس کا عکس تھا صرف چند الفاظ کی مدد سے پوری پوری کہانی بنانے کی ہدایت کی جاتی تھی اور اس طرح وقت کی زیادتی اور کمی کے اعتبار سے قوت متخیلہ کی تیزی و سستی کا اندازہ کیا جاتا تھا۔

اس کے علاوہ ایک اور دلچسپ کھیل جس سے بڑی حد تک تخیل کی رسائی کا اندازہ ہو سکتا ہے یہ ہے کہ چند حروف کی مدد سے (جن کی تعداد چھ تک ہو سکتی ہے) پانچ منٹ کے اندر جس قدر الفاظ بن سکتے ہوں، بنانے کی ہدایت دی جائے اور اس طرح الفاظ کی تعداد کے لحاظ سے تخیل کی بلندی یا پستی کا امتحان لیا جائے۔

تجرباتی نفسیات کی اسی مفروضہ مداخلت بے جا کے خلاف فلسفیوں نے صدائے احتجاج بلند کی ہے اُن کے اعتراضات کا ماحصل یہ ہے کہ تجرباتی نفسیات کا دائرۂ عمل بہت محدود ہے اور صرف مخصوص قسم کی تخیلی خصوصیات کا اندازہ ان تجربات کی مدد سے ہو سکتا ہے کیونکہ جہاں تک بلندی فکر اور مابعد الطبیعیاتی مسایل کا سوال ہے تجرباتی نفسیات ان کی گرد راہ کو بھی نہیں پا سکتی۔ میری کولنس (Mary Collins) اور ٹیمس ڈیور (James Dreuer) نے اس سوال کا بہت مسکت جواب دیا ہے اُن کا خیال ہے کہ فلاسفہ کی یہ دلیل کہ بلند خیالات جن کا تعلق روح سے ہوتا ہے، بے تصویر (Imageless) ہوتے ہیں قطعی غلط ہے کیونکہ تجربات شاہد ہیں کہ ہم جو کچھ بھی سوچتے ہیں وہ خیالات ہمیشہ با تصویر انداز میں ذہن کے اندر گزرتے ہیں بالکل اسی طرح جیسے کوئی فلمی کہانی پردہ سیمیں پر دکھلائی جا رہی ہو۔ اس مسئلہ پر ارسطو و افلاطون ہی کے وقت سے لوگوں نے غور کرنا شروع کر دیا تھا، چنانچہ ارسطو نے یہاں تک تسلیم کر لیا تھا کہ روح کی حقیقت اسی وقت تسلیم کی جا سکتی ہے جب ہم یہ ثابت کر دیں کہ وہ بلا جسم کی امداد کے کسی قسم کے خیالات کی پیدائش کا باعث ہو سکتی ہے اور یہ اسوقت تک ممکن نہیں جب کہ یہ مسئلہ طے نہ ہو جائے کہ ہم روحانی مسایل پر بغیر تصویری تخیل کے بھی کچھ سوچ سکتے ہیں اور یہ بہت مشکل ہے۔ کیونکہ تجربات سے یہی پتہ چلتا ہے کہ ہر خیال مادی وسایل کی امداد کا مرہون منت ہوتا ہے۔

یہاں پر مجھے ایک اور غلط فہمی کا ازالہ کرنا مقصود ہے جو بعض قدامت پرست شعراء اور ان کے متبعین کے ذہنوں میں اب تک جاگزیں ہے اور وہ یہ ہے کہ شاعرانہ خیالات عوام کی ذہنی سطح سے بلند ہوتے ہیں اور وہ ایک ایسے مخصوص وجدان کا نتیجہ ہوتے ہیں جس کا اس مادی دنیا سے کوئی علاقہ نہیں۔ لیکن ان حضرات کو معلوم ہونا چاہئے کہ "شاعری جزوے است از پیغمبری" کا نظریہ اب باطل ہو گیا ہے۔ کیونکہ یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ ہماری ہر حرکت خواہ وہ ذہنی ہو یا دماغی ایک یا چند اسباب و علل کی پیداوار ہوا کرتی ہے اور شعر گوئی اس منطقی گرفت سے علیحدہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ مجھے اس موضوع کو طوالت دینے کا افسوس ہے لیکن میں "حقایق کے انکشاف" کے مدنظر یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ بہترے بہتر غزل، نظم یا اشعار معرفت، ٹھوس مادی قوانین کے تحت (جو دماغی دُنیا میں تسلط پذیر ہیں) عرصہ وجود میں آتے ہیں۔ اُردو، فارسی اور عربی کی کسی پیشکش کے متعلق تو نہیں (کیونکہ مجھے کسی ایسی الوہی شاعری کا علم نہیں) البتہ انگریزی کے ایک شاعر کولرج (Coleridge) کی ایک نظم کبلاخاں (Kubla Khan) کے متعلق انگریز و امریکی ادیبوں اور نقادفن کا خیال تھا کہ اس کی شان نزول الوہی حیثیت رکھتی تھی۔ لیکن ماہرین نفسیات نے شاعر کی مزاجی اور ذہنی کیفیت کا تجزیہ کر کے یہ بتایا ہے کہ اس نظم میں کوئی بھی

بات ایسی نہیں کہی گئی ہے جس کا براہ راست یا بالواسطہ کولرج کی سابقہ شعوری اور غیر شعوری ذہنی پخت سے تعلق نہ رہا ہو اور اس نظم کو "اعجازی" رنگ دینا سراسر حماقت کا اظہار تھا پھر شاعر اور شاعری پر کیا منحصر ہے، ہر فرد بشر ذہنی اعتبار سے اسباب وعلل اور اُن کے نتائج کا پابند ہوتا ہے اور یہ ناممکن ہے کہ وہ اپنے حسیاتی تجربات کے حلقۂ اثر سے باہر کسی بات کو سوچ یا کہہ سکے۔ اس مسئلہ کی وضاحت کے لئے ہم خود اپنے (اور دوسرے عام آدمیوں) کے تجربات سے مستفید ہو سکتے ہیں، غالباً ہم میں سے ہر شخص اس بات کا مقر ہوگا کہ بعض اوقات ہمارے ذہن میں دفعتاً ایسے خیالات آتے ہیں جن کا بظاہر ہماری موجودہ ذہنی کیفیت سے کوئی علاقہ نہیں معلوم ہوتا، لیکن اگر ہم غور کریں تو پتہ چلے گا کہ ان سب خیالات کی کڑیاں ہمارے سابقہ واقعات اور احساسات سے مل جاتی ہیں۔ فرائیڈ نے اپنی معرکۃ الآرا تصنیف "گفتگو اور عمل کی غلطیوں" میں اسی نقطۂ نظر کو وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے کہ ہماری ہر غلطی خواہ زبان سے متعلق ہو یا اور کوئی عضویاتی غلطی ہو اپنے پیچھے اسباب وعلل کی ایک فوج رکھتی ہے۔ جن کی تاخت وتاراج کا نتیجہ اُن غلطیوں کے ظہور کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔ میں نے خود اپنی چند غلطیوں کا جو میری تحت الشعوری کیفیت کی آئینہ دار تھیں تجزیہ کیا تو مجھے اس قانون کی ہمہ گیری کا احساس ہوا۔ میرے تجربات کوئی بڑی اہمیت تو نہیں رکھتے لیکن پھر بھی ناظرین کی دلچسپی کے لئے حسب ذیل واقعہ پیش کرتا ہوں

ابھی چند ماہ گزرے ماہ رمضان میں، میں گرمیوں کی تعطیل کے سلسلہ میں گھر گیا ہوا تھا وہاں پر چونکہ اور لوگ روزہ رکھتے تھے اس لئے مجھے بھی اُن کا اتباع کرنا پڑا لیکن سگریٹ نوشی کی بُری عادت کے باعث "سحر کرنے" کے وقت سے افطار تک مجھے ہر وقت یہی انتظار رہتا تھا کہ کب دن غروب ہو اور روزہ افطار کر کے سگریٹ پیا جائے، سگریٹ کی یہ خواہش میرے اوپر ایسی مستولی رہتی تھی کہ اکثر دوران گفتگو میں میں بجائے "سحر" کے "افطار" کا لفظ استعمال کر دیتا تھا اور اس غلطی کا احساس مجھے بعد میں ہوتا تھا۔ میں نے جب اس مسئلہ پر غور کیا کہ بالخصوص "سحر" اور "افطار" کے الفاظ ہی کے استعمال میں کیوں مجھ سے غلطی ہوتی ہے تو مجھے پتا چلا کہ اس کا سبب میرا تحت الشعور تھا جسے سحر کا لفظ زبان پر لانا بھی ناگوار تھا اور وہ بجائے "سحر کے" "افطار" کا انتظار کیا کرتا تھا۔

میرے ایک اور عزیز تھے جن کو اگر کسی چیز کے خریدنے کے لئے پیسے دئے جاتے تھے تو وہ ہمیشہ اس کی زیادہ قیمت بتاتے تھے چنانچہ ایک مرتبہ ان کو بیس سیر شکر لانے کو پیسے دئے گئے لیکن وہ عادت سے مجبور تھے اس لئے انھوں نے صرف پندرہ سیر شکر لانے پر اکتفا کی اور گھر آ کر یہ کہدیا کہ شکر پوری بیس سیر ہے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اس کو وزن کرنے کی کون زحمت کرے گا مجھے ہمیشہ اُن پر شک رہتا تھا اس لئے میں نے اس سودے کو بھی بہ نظر اشتباہ دیکھا لیکن اُن پر اپنی اس ذہنی کیفیت کا اظہار نہیں ہونے دیا اور اُن سے اِدھر اُدھر کی گفتگو شروع کی جو شکر کی خرید سے غیر متعلق تھی لیکن چونکہ اُن کا ذہن اپنی اس چالاکی پر مسرور تھا یا یوں کہئے کہ وہ ابھی تک اس مسئلہ پر غور کر رہے تھے (لاشعوری طور پر) کہ آیا اُن کا دھوکا کامیاب ہو گیا یا نہیں لہٰذا انھوں نے گفتگو کے دوران میں ایک جگہ پر لفظ "پندرہ" (بالکل نادانستہ طور پر) استعمال کر دیا۔ بس پھر کیا تھا مجھے پتہ چل گیا کہ یہ یقیناً صرف پندرہ سیر شکر لائے ہیں اور میں نے آخر کار اُن سے اعتراف کرا لیا۔

ان تمام واقعات سے یہ پتا چلتا ہے کہ ہماری ذہنی کیفیت اسباب وعلل کی اسی طرح پابند ہے جس طرح اور مادی اشیاء ہوتی ہیں اس لئے ان کو روحانی حیثیت دینا غلطی ہے اور اگر ہمارے خیالات مادی حیثیت رکھتے ہیں تو پھر یقیناً وہ (خواہ وہ کتنے ہی دور از کار اور مابعد الطبیعیاتی حیثیت کیوں نہ رکھتے ہوں) جانچ اور امتحان کی گرفت میں آ سکتے ہیں۔

جلیل احمد ام۔ اے

تنقیدی اشارے

پروفیسر آل احمد سرور کے اُنیس تنقیدی مقالات کا مجموعہ جو ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہے۔ مقالات کی فہرست یہ ہے:۔ اُردو ناول کا ارتقا۔ اُردو میں افسانہ نگاری۔ اُردو شاعری میں خمریات۔ خطوط میں شخصیت۔ ہندوستانی ادب میں عالی کا درجہ اکبر کا آرٹ۔ چکبست لکھنوی۔ اقبال اور ان کا فلسفہ۔ رتن ناتھ سرشار۔ آغا حشر۔ سرسید کے خطوط۔ جدید اُردو تنقید وغیرہ۔ ۲۳۲ صفحات قیمت تین روپے

میر و راسخ کا تقابلی مطالعہ

غمِ عشق جب دل میں گھر کرتا ہے تو ظاہری شکل و صورت پر بھی اثر ڈالتا ہے۔ کوئی اس راز کو چھپانا بھی چاہے تو کامیاب نہیں ہو سکتا عاشق کی ظاہری صورت اس کے دلی کیفیت کی غمازی کرتی ہے۔ میر کے یہاں اکثر اشعار اس مضمون کے پائے جاتے ہیں:۔

میر:۔ قامت خمیدہ، رنگ شکستہ، بدن نزار — تیرا تو میر غم میں عجب حال ہو گیا

" جلتے آنکھوں میں پڑ گئے، منہ زرد — ہو گئی میر تیری کیا صورت

" کچھ زرد زرد چہرہ کچھ لاغری بدن میں — کیا عشق میں ہوا ہے اے میر حال تیرا

راسخ کی بھی ظاہری صورت سے غمِ عشق آشکار ہے۔ بلکہ دیکھنے والے اس حال ابتر کے دیکھنے کی تاب نہیں رکھتے۔

ہونٹھ ہیں سوکھے تر ہیں آنکھیں زرد ہے چہرہ راسخ آہ — بندہ سے صاحب حال تمہارا اب نہیں دیکھا جاتا ہے

فطرت کا خاصہ ہے کہ جب کسی واقعہ یا حادثہ کا ظہور ہوتا ہے تو اس سے پہلے ہی ہزاروں وسوسے اور خیالات پیدا ہونے لگتے ہیں

کسی کا شعر ہے:۔ ہے کوئی بات آج ہونے کو — دل بہت چاہتا ہے رونے کو

میر کے دل پر بھی یہی حالت طاری ہوتی ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ یار کی خبر سننے میں آئے گی:۔

آج ہمارا دل تڑپے ہے کوئی وہاں سے آوے گا — یا کہ نوشتہ اُن ہاتھوں کا قاصد ہم تک لاوے گا

میر ہی کا دوسرا شعر ملاحظہ ہو:

دیکھئے کیا ہو سانجھ تلک احوال ہمارا ابتر ہے — دل اپنا تو بجھا سا دیا ہے جان چراغِ مضطر ہے

راسخ کا دل بھی بے تاب ہے، ایک اُلجھن ہے، مگر یہ انتہائے شعریت ہے کہ اس کا اظہار نہیں کیا جاتا کہ آخر اس کا سبب کیا ہے بلکہ ایک حالت طاری کر دی گئی ہے اور انتظار ہے کہ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔

راسخ:۔ صبح سے ہے بے تابی دل کو آہ نہیں کچھ بھاتا ہے — دیکھئے کیا ہو شام تلک دل آج بہت گھبراتا ہے

حافظ نے پہلے ہی چونکا دیا تھا کہ "عشق آساں نمود اول ولے افتاد مشکلہا" مگر "ہر بوالہوس نے عشق پرستی شعار کی" اور یہ سمجھا کہ منزلِ عشق طے کر لوں گا مگر قدم رکھتے ہی معلوم ہوا کہ یہ بڑی کٹھن راہ ہے۔ میر فرماتے ہیں:

خطرے بہت ہیں میر رہِ صعبِ عشق میں — ایسا نہ ہو کہیں کہ دل و دیں کو کھو رہو،

صحرائے محبت ہے قدم دیکھ کے رکھ میر — یہ سیر سرِ کوچہ و بازار نہ ہووے

راسخ کو بھی یہی اندیشہ ہے۔ وہ اس طرح متنبہ کرتے ہیں:۔

بے دردی سے طے کیجیو نہ راہ طلبِ یار — ہاں دیکھو پامال کوئی خار نہ ہووے

اگر کچھ درد رکھتا ہے تو راہِ عشق یوں طے کر — نہ کانٹا کوئی ٹوٹے اور پھوٹے آبلہ پا کا

قدم نہ رکھ رہ مشکل گزارِ عشق میں تو — کہ سرسری نہیں طے کرنا ایسی راہوں کا

بن سر دئے طے ہو نہ رہِ پرخطرِ عشق — یہ راہ دم تیغ ہے، برچھی کی انی ہے

داغ نے کیا خوب کہا ہے:۔ رہروِ راہ محبت کا خدا حافظ ہے — اس میں دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں

عشق کی مصیبت میں پھنس کر بیچارہ عاشق پہلے ہی قدم پر رونے لگتا ہے:

میر:۔ ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا ؟ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا !!

راسخ کو بھی یہی مصیبت پیش آتی ہے:۔

ہنسی سمجھے تھے راسخ طے صحرائے محبت کو سو میری جان گامِ اولیں پر رو دیا تم نے
شروع عشق راسخ کہتے ہو جاتا ہے دل ڈوبا کنارے ہی پہ اس دریا کے حال ایسا تمہارا ہے

عشق کی راہ ایک پرخطر راہ ہے۔ پھر اس پر راہ کی ناہمواری اور صعب گزار وادی، عاشق صبر کی تاب نہیں رکھتا اور شکوہ کرنے لگتا ہے۔

میر:۔ منزل پہونچنا اک طرف نے صبر ہے نہ ہے سکون یک سر قدم میں آبلے پھر راہ پرخار اس قدر
راسخ:۔ کرتے ہیں شکوہ آبلہ کا ہر قدم پہ ہم طے خاک ہم سے ہوگا بیابان عشق کا

دمِ آخر یار کا بالیں پر آنا بہتوں نے لکھا ہے۔ جبکہ عاشق دم توڑ رہا ہو، معشوق آیا بھی تو کیا ؟

ع: صبح دم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا ؟

غالب نے کیا خوب کہا ہے:۔

مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں ہے ہے !! یار لائے مری بالیں پہ اُسے پر کس وقت ؟

درحقیقت یہ شعر میر کے اس شعر سے ماخوذ ہے:۔

حیف وے جب کے وہ اس وقت میں پہونچا جو وقت اُن کے حال اشاروں سے بتایا نہ گیا،

میر کے یہاں الفاظ میں اُلجھاؤ ہے۔ غالب نے اس شعر کو بلند کر دیا ہے اس پر بلاغت کا یہ پہلو کہ وہ خود نہیں آیا بلکہ احباب اسکو لے آئے معشوق کی شانِ خودداری کو قایم رکھا ہے۔ اسی مضمون کو راسخ نے اس طرح ادا کیا ہے:۔

بیٹھے تب وے مری بالیں پہ کہ جب ضعف سے میں اُٹھ کے اُن پاؤں پہ سر رکھنے کے قابل نہ رہا،
بیٹھنے آئے مری بالیں پہ لیکن ہائے کب جب علاقہ جاں کا جسم ناتواں سے اُٹھ گیا

نامراد عشاق کے پاس آہ و نالہ کے سوا اور کون سا مشغلہ ہے۔ ان کی آہوں کا دھواں کائنات پر چھا جاتا ہے اور یہ خیال ہوتا ہے کہ آسمان ان ہی کے آہوں کا دھواں تو نہیں:۔

میر:۔ جس کو تم آسمان کہتے ہو سو دلوں کا غبار ہے اپنا
راسخ:۔ آسماں اس کو نہ جانو یہ جو آتا ہے نظر ہو گیا ہے کچھ دھواں پن اپنے دل کی آہ کا

کچھ دنوں کے بعد غالب نے بھی یہی سمجھا:۔ دودِ سودائے تتق بست آسماں نامیدمش

دلِ بے مدعا ایک نعمتِ عظمیٰ ہے۔ جس کو یہ حاصل ہو گیا اس کو بہ قول میر خدائی ہاتھ آگئی۔

میر:۔ سراپا آرزو ہونے نے بندہ کر دیا مجھ کو وگرنہ میں خدا تھا گر دلِ بے مدعا ہوتا

راسخ بھی دلِ بے مدعا کے حصول کے لئے دست بدعا ہونا چاہئے مگر پھر خیال آتا ہے کہ دل بے مدعا کا مدعا بھی بہرحال مدعائے دل ہی ہے پھر دلِ بے مدعا کہاں رہا۔

اگر بابِ اجابت تک رسا اپنی دُعا ہوتی تو جی میں تھا کہ خواہانِ دلِ بے مدعا ہوتے
بے مدعا ہوں یہ بھی ہے اک مدعائے دل اس قیدِ مدعا سے نہ کوئی رہا ہوا

عشق ہمیشہ ایک راز ہی رہا۔ سب نے اس کی حقیقت سمجھنے کی کوشش کی مگر ناکام رہے بہت سمجھا تو "شاید" سے زیادہ نہ بڑھ سکے شیفتہ نے کیا خوب کہا ہے:۔ شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ ہے آگ سی جو سینے کے اندر لگی ہوئی

حالی نے بھی ایسا ہی کہا ہے :۔

عشق سنتے تھے جسے ہم وہ یہی ہے شاید — خود بخود دل میں ہے اک شخص سمایا جاتا

سودا بے اختیار پکار اُٹھے :

عشق سے تو نہیں ہوں میں واقف — دل میں شعلہ سا کچھ لپٹتا ہے،

تیر نے بھی مختلف اشعار میں اس حقیقت کا اظہار کیا ہے :۔

ہم طور عشق سے تو واقف نہیں ہیں لیکن — سینے میں جیسے کوئی دل کو ملا کرے ہے
چھاتی جلا کرے ہے سوزِ دروں بلا ہے — اک آگ سی رہی ہے کیا جانئے کہ کیا ہے،
گر عشق نہیں ہے تو پھر کیا ہے بھلا مجھ کو — جی خود بخود اے ہمدم کاہے کو کھپا جاتا
محبت نے شاید کہ دی دل کو آگ — دھواں سا ہے کچھ اس نگر کی طرف
کیا جانئے کہ چھاتی جلے ہے کہ دل کا داغ — اک آگ سی لگی ہے کہیں کچھ دھواں سا ہے

وہی عشق کہیں سینہ میں آگ بن کر شعلہ زن ہے، کہیں ایک "شخص" بن کر دل میں سماتا ہے، کسی کے دل میں شعلہ سا لپٹتا ہے۔ کسی کا دل جلتا ہے کسی کا دل کھپاتا ہے، وہی عشق راسخ کے جگر میں کانٹا سا کھٹکتا ہے :۔

لاگ اس پلک کی اتنی ہی معلوم ہے کہ آہ — کانٹا سا کچھ جگر میں ہے اپنے چبھا ہوا

"تعرف الاشیاء باضدادہا" ایک مشہور مقولہ ہے اور حقیقت پر مبنی۔ سفید رنگ سیاہ ہی پر کھلتا ہے۔ اگر رات نہ ہوتی تو دن کی کوئی وقعت نہ تھی۔ قائم نے سچ کہا ہے :۔

موقوف ضد ہی پر تو ہے ہر شے کی معرفت — کچھ کفر بھی ضرور ہے اسلام کے لئے

تیر نے کفر کو اسلام کی رونق کا سبب بتایا اور اس کی شاعرانہ توجیہ کی :۔

کفر کچھ چاہئے اسلام کی رونق کے لئے — حسن زنار ہے تسبیحِ سلیمانی کا

راسخ نے اسی مضمون کو یوں ادا کیا۔

کئے اضداد ظاہر قدرتاً معلوم ہو شے کی — جہنم کے مقابل خلد جاوداں کیا پیدا

مسلک تصوف میں ظاہری اور جسمانی تعلقات سے درگزر کیا جاتا ہے یہاں تک کہ اہل تصوف کا کعبہ بھی کوئی اور کعبہ ہے، دل ہی انکا کعبہ مقصود ہے، جہاں معشوق حقیقی جلوہ گر ہے :۔

تیر :۔ بنا کے کعبہ کا رستہ بھلا دوں اسکی راہ — نشاں جو پوچھے کوئی مجھ سے یار کے گھر کا

گویا کعبہ کا رستہ بتا کر سالک کو منزلِ مقصود سے بھٹکا دینا ہے۔ حقیقی منزل تو اور ہی کہیں ہے۔ راسخ کے یہاں کعبہ محض ایک راہ ہے۔ منزل تو ان کی بھی کہیں اور ہے :۔

مقیم کعبہ کب ہوں جانے والے کعبۂ دل کے — اقامت راہ میں کرتے نہیں مشتاق منزل کے
طالبانِ یار کی منزل تو غیر از دل نہیں — کعبہ کہتے ہیں جسے سو راہ ہے منزل نہیں

قرآن کریم کی آیت "عرض امانت" اور حافظ کا "قرعۂ فال" والا شعر بہت عام مضمون ہے۔

میر صاحب فرماتے ہیں :۔ سب پہ جس بار نے گرانی کی، — اس کو یہ ناتواں اُٹھا لایا

راسخ نے بھی چند اشعار اسی مضمون کے لکھے ہیں۔ پہلے شعر کی بلند آہنگی اور جوش و خروش دیکھئے :

خمِ گردوں کو تک جس کا نہ یارائے تحمل تھا — وہی صہبائے تندِ خم شکن ہم کو پلا دی ہے

افلاک امانت کے : حامل ہوئے راسخ — کیونکر متحمل ہے تو اس بار گراں کا ؟
آسماں پر گرانی جس نے کی — بوجھ وہ تیرے ناتواں سے اُٹھا

اسی مضموں کو نئے پیرایہ میں شاد عظیم آبادی نے کس خوش اسلوبی سے لکھا ہے :-

امانتِ غم کے سونپنے کو قضا نے جب آکے فال کھولی — جو سب سے عاجز تھے اس گلی میں انھیں غریبوں کا نام نکلا

فریاد عظیم آبادی کا ایک قدسی شعر ہے :-

ہمسایہ زنالیدنِ من نالد و گوید — ایں نالہ چہ دارد کہ شنیدن نہ توانم

اسی سلسلہ میں خاقانی کا بھی شعر سنئے :-

ہمسایہ شنید نالہ ام گفت — خاقانی را دگر شب آمد

مگر ہمسائے ہر طرح کے ہوتے ہیں، غمخوار بھی اور دل آزار بھی۔ مگر جب کوئی رات کی رات آہ و فغاں کرتا رہے تو ہمسایہ کہاں تک اپنی نیند خراب کرے گا۔ سودا نے کہا :-

سودا تری فریاد سے آنکھوں میں کٹی رات — اب آئی سحر ہونے کو ٹک تو کہیں مر بھی

میر اپنے مخصوص لب و لہجہ میں یوں فرماتے ہیں :-

جو اس شور سے میر روتا رہے گا — تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا
کریں خواب ہمسائے کیونکر کہ یاں، — بلا شور و فریاد و زاری رہے
ہمائے مجھے رات کو رویا ہی کرے ہیں — سوتے نہیں بیچارے مری نالہ کشی سے

راسخ :- چپ ہو راسخ کب تلک یہ نالے یہ آہیں یہ شور — خوف ہے مجھ کو کہ ہمسائے نہ گھبرا دیں کہیں

مسئلہ جبر و اختیار اسلامی ادبیات کا ایک خاص مضمون رہا ہے اور ہمارے شعرا زیادہ تر "جبری" واقع ہوئے ہیں درد فرماتے ہیں :-

جب کہتے ہو کہ ہے وہی ہادی وہی مضل — تو راہ پر ہیں سب کوئی گمراہ ہی نہیں

میر مجبورانہ شان سے یوں رقم طراز ہیں :

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی — چاہیں ہیں سو آپ کرے ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

راسخ نے بھی اپنی مجبوری کا اظہار کیا ہے مگر سچی بات یہ ہے کہ میر کی بے کسی کو نہیں پہونچتے :-

مت کہو مختار ہم سے جبریوں کو تم کہ آہ — چشم و دل پر بھی نہ اپنے اختیار اپنا ہوا

معشوق کی غیر موجودگی میں دل میں حوصلے بہت ہوتے ہیں اور خواہشات کی ایک دنیا بستی ہے مگر اس کے آتے ہی کچھ ایسی چپ لگ جاتی ہے کہ دل کا شوق دل ہی میں رہ جاتا ہے اور ایک حرف بھی زبان پر نہیں آنے پاتا۔ داغ کا یہ شعر کس نے نہیں سنا :-

کہنے دیتی نہیں کچھ منہ سے محبت تیری — لب پہ رہ جاتی ہے آ آ کے شکایت تیری

نظام رام پوری جو معاملاتی شاعری میں مشہور ہیں ان کے بھی دو شعر سن لیجئے :

باتیں تھیں دل میں کیا کیا کہنے کو تھے نہ کیا کچھ — منہ سے نہ اس کے آگے بھی کلام نکلا
حیران سے رہ جاتے ہیں ہم سامنے اس کے — ہم سے تو نظام اس کا گلہ ہو نہیں سکتا

ان سب سے بہت پہلے میر کو بھی یہی معاملہ پیش آچکا ہے :-

کتنی باتیں بنا کے لاؤں لیک — یاد رہتی ترے حضور نہیں

دو شعر اور ملاحظہ ہوں :- کہتے تو ہو یوں کہتے یوں کہتے جو وہ آتا — یہ کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

دل میں مسودے تھے بہت پر حضور یار نکلا نہ ایک حرف بھی میری زبان سے

راسخ اسی مضمون کو اس طرح لکھتے ہیں :-

تھا جی میں کہ دشواری ہجر اس سے کہیں گے پر جب ملے کچھ رنج و محن یاد نہ آیا
بھلا کہو، کہیں ایسے سے اپنا کیونکر حال کہ جب وہ سامنے ہو طاقتِ بیاں نہ رہے

لیکن حقیقت یہ ہے کہ سب کے سب سعدی کے خوان ادب کے زلہ ربا نہیں :-

سعدی :- گفتہ بودم چو بیائی غمِ دل با تو گویم چہ بگویم ؟ کہ غم از دل برود چوں تو بیائی

عاشق خود معشوق کی طرز دلبری کا شاکی ہوتا ہے کہ تیری صورت اتنی پیاری اور دلربا ہے کہ ہم دل دینے پر مجبور ہیں۔ میرا تصور کیا ہے۔ تجھے آپ اپنا شاکی ہونا چاہیئے۔

میر :- پیار کرنے کا جو خوباں تجھ پہ رکھتے ہیں گناہ ان سے بھی تو پوچھئے تم اپنے کیوں پیارے ہوئے
راسخ :- دل دیا گر اس کو ہم نے مت ملامت کر ہمیں ان سے کہہ ناصح کہ اتنے دلربا تم کیوں ہوئے

یہ دونوں اشعار سعدی کے اس شعر سے ماخوذ ہیں :-

دوستاں منع کنندم کہ چرا دل بتو دادم بایداول بتو گفتن کہ چنیں خوب چرائی ؟

کسی نے کیا خوب کہا ہے :

ان کی نظروں کو کوئی کہتا نہیں دل ہمارا مفت میں بدنام ہے

وحید الہ آبادی یوں کہتے ہیں :-

وہ مجھ سے کہتے ہیں تری آہیں غضب کی ہیں اس کی خبر نہیں کہ نگاہیں غضب کی ہیں

عاشق کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں کرتا۔ اگر بیچارہ دیوار یار کے نیچے پڑ رہتا ہے تو لوگ طعنہ زن ہوتے ہیں کہ وہ تو آرام طلب ہے۔ چین سے سایہ میں سوتا ہے۔ اس کو محبت سے کیا لگاؤ۔ میر کا مشہور شعر ہے :-

ہوگا کسو دیوار کے سائے کے تلے میر کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو

راسخ نے بھی اسی طرح طعن آمیز اشعار کہے ہیں :-

مت کرو عشق کا دعوے راسخ عشق تم کو نہیں زیبا راسخ
رنج کش عشق کے کب ہو صاحب تم تو آرام طلب ہو صاحب
سایہ ہی ڈھونڈھو ہو سونے کے لئے دل خوش چاہو ہو رونے کے لئے

مگر جو بات میر نے ایک شعر میں کہی راسخ تین شعر میں بھی وہ ٹیکھاپن پیدا نہ کر سکے۔

جو لوگ عشق میں آوارہ و سرگرداں ہیں ان کا پتہ یہی ہے کہ خاک کی طرح پریشاں حال ہیں۔ میر نے کہا ہے :-

آوارگان عشق کا پوچھا جو میں نشاں مشت غبار لے کے صبا نے اڑا دیا

راسخ کہتے ہیں :- لے ایک کف خاک اڑا دیجو پریشاں گر پوچھے مرا حال وہ اے بادشمالی

جب کوئی واقعہ خلاف توقع ظہور پذیر ہوتا ہے جس کا سان گمان بھی نہ ہو۔ اور وہ واقعہ جس ذریعہ سے ظہور پزیر ہوا ہے، اس میں بہ ظاہر اس کی مجال نہ ہو تو کہتے ہیں کہ "کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں"

میر نے کیا خوب کہا ہے :- فلک کا منہ نہیں اس فتنہ کے اٹھانے کا ستم شریک ترا ناز ہے زمانے کا
راسخ کہتے ہیں :- فلک ایسا ہمارے درپئے ایذا نہ تھا پہلے یہ بے میری تمھاری ہے، تمھارا ہی اشارا ہے

معشوق کے در کا گدا ہونا ایک ایسی سعادت ہے جس کی آرزو شاہوں کو بھی ہے۔

میر کہتے ہیں :- ہزار مرتبہ بہتر ہے بادشاہی سے — اگر نصیب ترے کوچے کی گدائی ہو

راسخ اس طرح کہتے ہیں : شاہوں کو بھی ہے ایسی گدائی کی آرزو — رشک اس پہ ہے جو در کا تمہارے گدا ہوا

عالم بے خودی میں انسان اپنی ہستی اس طرح فراموش کر دیتا ہے کہ اپنی اس فراموش کاری کو بھی فراموش کر جاتا ہے، غالب کس بلند آہنگی سے اس مضمون کو ادا کرتے ہیں :-

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی — کچھ ہماری خبر نہیں آتی،

میر اور راسخ نے بھی اس مضمون کو اپنے اپنے پیرایہ میں ادا کر لیا ہے :-

میر :- ہم آپ سے جو گئے ہیں گئے ہیں مدت کے — الٰہی اپنا ہمیں کب تک انتظار رہے
ہم آپ سے گئے سو الٰہی کہاں گئے — مدت ہوئی کہ اپنا ہمیں انتظار ہے
مدت ہوئی کہ اپنی خبر کچھ نہیں ہمیں — کیا جانئے کہ میر گئے ہم کدھر تئیں،
بے خودی لے گئی کہاں ہم کو — دیر سے انتظار ہے اپنا،
خدا جانے ہمیں اس بیخودی نے کس طرف پھینکا — کہ مدت ہوگئی ہم کھینچتے ہیں انتظار اپنا

راسخ :- کیا جانوں لے گئی ہے کدھر بے خودی مجھے — برسوں ہوئے کہ آپ ہوں میں انتظار میں
کیا جانیں کہاں بے خودی تم بن ہمیں لے گئی — دشوار ہوا ہے بہت اب آپ میں آنا

عشق ایک روحانی لذت ہے، عاشق اس لذت کے لئے بے قصد و ارادہ کوچۂ محبوب کا طواف کرتا رہتا ہے۔ یہی اس کی زندگی ہے۔ لوگ اس کو پکڑ لاتے ہیں مگر پھر موقع پاتے ہی چپکے سے وہ نکل کھڑا ہوتا ہے پھر وہی گلی ہے اور اس کا طواف۔

مصحفی نے کیا خوب کہا ہے :- ترے کوچے اس بہانے مجھے دن سے رات کرنا — کبھی اس سے بات کرنا کبھی اُس سے بات کرنا

میر فرماتے ہیں :- چلانہ اُٹھ کے وہیں چپکے چپکے پھر تو میر — ابھی میں اس کی گلی سے پکار لایا تھا

راسخ کہتے ہیں :- صبح ہوتے ہی گیا راسخ گلی میں اس کی پھر — کل میں ساری رات اُسے باآنکہ سمجھاتا رہا

انسان کی ساری کوششوں کے بعد اگر امید اپنا رخ دکھاتی ہے تو کس قدر مسرت ہوتی ہے مگر عین اس وقت جبکہ کامیابی بالکل قریب ہے اور منزل مقصود سامنے، ناکامی اور حرماں نصیبی سے دوچار ہونا پڑے تو کس قدر جائے حسرت و افسوس ہے۔ مصحفی کا مشہور شعر ہے :

قسمت تو دیکھئے کہ کہاں ٹوٹی جا کمند — دو چار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گیا

اسی مضمون کو میر اور راسخ اس طرح لکھتے ہیں :-

میر :- ملے کیونکر دکھ افسوس جی جاتا ہے میر — ڈوبتی ہے کشتی ورطہ سے نکل ساحل کے پاس
راسخ :- کروں کیا شرح محرومی کو راسخ آہ میں وہ ہوں — کہ ڈوبی ہے مری کشتی پہونچ کر پاس ساحل کے

عاشق رو رو کر اپنا حال زار بیان کرتا ہے۔ ایک بات کہتا ہے پھر روتا ہے، پھر کہتا ہے اور روتا جاتا ہے ایسی حالت میں سننے والا کیا خاک سمجھے گا۔ میر کا شعر ہے :-

احوال میر جی کا مطلق گیا نہ سمجھا، — کچھ زیر لب کہا بھی تو دیر دیر رو کر

مضمون معمولی، اور صاف ہے مگر اسی مضمون کا ایک شعر راسخ کا بھی ہے جو اس سے زیادہ بلند اور معنی خیز ہے۔ حالت یہ ہے کہ عاشق معشوق کے جور و ستم کا گلہ کرتا ہے اور کہتے کہتے روتا بھی جاتا ہے۔ سننے والا پریشان ہے کہ یہ کس طرح کا گلہ ہے کہ معشوق کا گلہ بھی ہے پھر اس کی محبت چھوڑی بھی نہیں جاتی۔ حالانکہ جب گلہ ہی کرتا ہے تو اس کی محبت سے دست بردار ہو جانا چاہئے، مگر عاشق اپنے دل سے

مجبور ہے۔ جب ظلم و جور سے اکتا جاتا ہے تو گلہ طرازی شروع کرتا ہے مگر ملاحبت کرنے پر مجبور ہے۔ اس لئے معشوق سے کنارہ کش بھی نہیں ہو سکتا :- غرض دو گونہ عذاب است جانِ مجنوں را بلائے صحبتِ لیلیٰ و فرقتِ لیلیٰ

اب راسخ کا شعر سنئے اور لطف اُٹھائیے :

تمھاری بات اے راسخ سمجھ میں کس طرح آئے گلہ بھی یار کا کرتے ہو اور روتے بھی جاتے ہو

یعنی سننے والا یہ کہہ رہا ہے کہ جب گلہ ہی کرنا ہے تو پھر روتے کیوں ہو ؟ اس کی محبت کا دم کیوں بھرتے ہو ؟ معلوم ہوا کہ تمھاری محبت راسخ نہیں ہے ورنہ گلہ طرازی کیوں کرتے۔ یہ تو کچھ عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے اس کی محبت کا بھی دعوےٰ ہے کہ پھر اسکی شکایت بھی ہے

ناصح رونے سے منع کرتا ہے۔ عاشق مجبورِ گریہ ہے، کہتا ہے کہ میرا اختیار کیا ہے جو میں نہ روؤں۔ رونا اک جذبۂ اختیار ہے میر کا شعر ہے :- منع گریہ نہ کر تو اے ناصح اس میں بے اختیار ہیں ہم بھی

لیکن اس سے زیادہ بے اختیاری اس کیفیت میں ہے کہ آپ کسی کو رونے سے منع کریں اور وہ اُلٹے اور زیادہ رونے لگے۔ یہ ایک حقیقت ہے اور آئے دن کا مشاہدہ کہ رونے والے کو جتنا زیادہ چپ کرنے کی کوشش کی جائے گی وہ اور زیادہ رونے لگے گا۔ راسخ کا شعر ملاحظہ ہو :- ہوئے مانع گریہ راسخ کو ہم سو وے اور روئے نصیحت کے بعد

رشک ایک فطری جذبہ ہے۔ خاص کر عشاق کے دل میں یہ جذبہ بہت زیادہ ہوتا ہے وہ نہیں چاہتے کہ رقیب معشوق کے ہاتھ سے کشتۂ تیغ ہو۔ میر کا مشہور شعر ہے :-

جاتا ہے یار تیغ بکف غیر کی طرف، اے کشتۂ ستم تری غیرت کو کیا ہوا ؟

پھر کہتے ہیں :- چلا ہے تیغ بکف یار غیر کی جانب ہوئے ہیں میر تماشائی غیرت انکو نہیں

راسخ کا بھی ایک شعر اسی مضمون کا سن لیجئے :-

غیر ہوں کشتۂ تیغ اس کے بھلا ہم راسخ فرطِ غیرت سے گلا کاٹیں نہ کیونکر اپنا

معشوق کے حسن کی لطافت میں کس کو شک ہو سکتا ہے۔ اپنے اپنے حوصلے کے مطابق سب تعریف کرتے ہیں میر کے معشوق کے تن نازک کی لطافت کا مقابلہ کسی جان پاک کی لطافت ہی کر سکتی ہے مگر راسخ کے معشوق کی "جان مجسم" کی لطافت کا کیا پوچھنا، وہ تو اتنی لطیف ہے کہ آئینہ بھی اس کے عکس کا متحمل نہیں ہو سکتا ہے۔

میر :- کہئے لطافت اس تنِ نازک کی میر کیا، شاید یہ لطف ہوگا کسو جانِ پاک میں

راسخ :- اس جانِ مجسم کی بیاں کیا ہو لطافت عکس آئینہ میں جس کا نمودار نہ ہووے

کس صورت اس کے تن سے آئینہ منعکس ہو وہ مایۂ لطافت جاں سے لطیف تر ہے

عاشق غیرت مند ہونے کے ساتھ ہی ساتھ بے حد رشک پسند واقع ہوا ہے، اس کی غیرت اور جذبۂ رشک اُسے اجازت نہیں دیتا کہ معشوق کے عکس کو آئینہ سے دوچار ہونے دے، معشوق کا آئینہ دیکھنا عاشق کے لئے آئینہ سے بیزاری کا سبب ہو گیا اور آئینہ کی طرف سے دل میں غبار پیدا ہو گیا۔

میر :- وجہ یہ تھی کہ ترے ساتھ لڑی اسکی آنکھ ہم جو صورت سیتی آئینہ کے بیزار رہے

راسخ :- یوں صاف عکس یار سے وہ ہمکنار ہو کس صورت آئینہ سے نہ ہم کو غبار ہو

کیفیت عشق چھپائے نہیں چھپتی، چہرہ اس راز کو فاش کر دیتا ہے اکثر آنسو کے قطرے اس حقیقت کی غمازی کرتے ہیں، حافظ کا مشہور شعر ہے :-

ترا حیا و مرا آبدیدہ شد غماز وگرنہ عاشق و معشوق راز دار انند

میر اور راسخ دونوں کے دواوین میں کثرت سے اس مضمون کے اشعار ملتے ہیں ملاحظہ ہو:۔

میر:۔ کیا پھر نظر چڑھا ہے اے میر کوئی خوشرو
یہ زرد زرد چہرہ تیرا اتر رہا ہے،

رہتے ہیں میر بے خود و وارفتہ اندنوں
پوچھو کنایتہً کسو سے دل لگا نہ ہو

میر جی زرد ہوتے جاتے ہو،
کیا کہیں تم نے بھی کیا ہے عشق

راسخ:۔ مگر راسخ نے دل پر کوئی تازہ چوٹ کھائی ہے
شب اس کو میں نے جو دیکھا بہت گریاں و محزوں تھا

کچھ چوٹ سی دل پر ہے جو یوں روتے ہیں راسخ
صاحب تمھیں کس مرتبہ پاتے ہیں حزیں ہم

(پروفیسر) عطاء الرحمان

قابل قدر مجرب نسخوں کے راز کا انکشاف

خدمت خلق کے ساتھ ساتھ عزت، شہرت اور دولت بھی حاصل کیجئے!

حضرات! مندرجۂ ذیل نسخے میرے تیس سالہ تجربات کا حاصل ہیں۔ ان میں سے بعض نسخے تو میرے خاندان میں پشت ہا پشت سے سینہ بسینہ چلے آتے تھے۔ اور بعض میری کاوشوں کا نتیجہ ہیں، یہ وہ نادر و نایاب نسخے ہیں جو صحیح تشخیص کے بعد اس مرض کے لئے حرف آخر کا حکم رکھتے ہیں اس وقت تک ان نسخوں کا اظہار کسی قیمت پر بھی نہ کیا گیا۔ مگر اب اس خیال سے کہ دنیا چند روزہ ہے ایسے نادر روزگار گرانمایہ جواہرات کو سینے میں مقفل رکھنا مناسب نہیں۔ خدا کو حاضر ناظر جان بلا کم و کاست قلیل ہدیہ میں نذر ناظرین کئے جاتے ہیں۔ یہ نسخے سو فیصدی مجرب ہونے کے علاوہ نہایت آسان، کم قیمت اور سہل الحصول ہیں جنھیں ایک عام آدمی بھی بلا تکلف طیار کر سکتا ہے اور اجزا ہر جگہ دستیاب ہو سکتے ہیں۔ ان نسخوں کے منگانے کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ سفر جو میں نے تیس سال کی طویل مدت میں قطع کیا تھا۔ آپ اسے ایک دن میں طے کر سکیں گے یعنی ؎ جائے کہ زاہداں بہ ہزار اربعین رسند مست شراب عشق بہ یک آہ می رسند

(۱) تپدق کا مکمل علاج۔ چار نسخے عرق۔ سفوف۔ لعوق۔ کشتہ ہڑتال درقی باوزن ہدیہ عنہ ر

(۲) نسخہ پائیوریا صرف تین دن میں مرض کو نیست و نابود کر دیتا ہے ہدیہ عنہ

(۳) بواسیر کا شافی نسخہ صرف کھانے سے مسے مرجھا کر گر جاتے ہیں ہدیہ عنہ

(۴) خواب آور نسخہ۔ بعض اوقات مریض کو نیند نہیں آتی۔ جس کی وجہ سے کئی دوسرے امراض لاحق ہو جاتے ہیں۔ اس سے نیند خوب آتی ہے۔ ہدیہ عنہ ر

(۵) آنکھوں کے جملہ امراض کی بے مثل سال دوا، ہدیہ ص ر

(۶) اکسیر مستورات۔ عورتوں کے لئے بے بہا نسخہ ہر قسم کی اہوا و ری خرابیاں اور اندرونی نقایص دور ہو جاتے ہیں، ہدیہ ص ر

(۷) اکسیر اطفال۔ بچوں کے لئے بے نظیر نسخہ۔ برے پیلے دستوں کا آنا اور دیگر عوارضات جو دانت نکلتے وقت بچوں کو ہو جاتے ہیں انکا تریاق ص ر

(۸) تریاق جریان عنہ ر (۹) اکسیر سوزاک عنہ ر۔ اکسیر آتشک عنہ ر

(۱۰) طاقت کا ایک بے نظیر نسخہ۔ جس پر صرف چند پیسے لاگت آتی ہے۔ عنہ ر

بیرونی علاج کے لئے پٹی ہدیہ عنہ ر

(۱۱) سانپ کاٹے کا مجرب عمل ہدیہ ص ر

(نوٹ) ان نسخوں کے ذریعہ آپ نہ صرف خدمت خلق کا فریضہ بطریق احسن ادا کر سکتے ہیں بلکہ کسی ایک نسخہ کی تجارت کر کے لازوال عزت اور دولت کے مالک بھی بن سکتے ہیں۔

حکیم اقبال حسن روبرو دربار داتا گنج بخش لاہور

باب الاستفسار

نُصیری اور علی اللّٰہی

(جناب سید کرم حسین صاحب جونپور)

غالب نے ایک جگہ اپنے متعلق لکھا ہے :-

ہم اسد اللّٰہم و ہم اسد اللّٰہیم

کیا اسد اللّٰہی سے مراد مسلک علی اللّٰہی ہے، اور کیا یہ اس کا دوسرا نام نصیری بھی ہے ؟ اگر یہ دونوں ایک دوسرے سے مختلف ہیں تو وجہ اختلاف کیا ہے ؟

(نگار) غالب نے اپنے آپ کو اسد اللّٰہی یعنی پیرو علی ظاہر کیا ہے۔ اور علی اللّٰہی سے مراد وہ جماعت ہے جو حضرت علی کو خدا کہتی ہے۔ نُصیری اور علی اللّٰہی دونوں جماعتیں غلوئے شیعیت کا نتیجہ ہیں، لیکن ان دونوں کے عقاید و مراسم میں بہت فرق ہے۔

علی اللّٰہی اپنے آپ کو اہلِ حق بھی کہتے ہیں، یہ مسجدوں میں نہیں جاتے اور نہ کسی ناپاکی کو تسلیم کرتے ہیں۔ وہ طلاق اور ایک سے زیادہ شادی کرنے کے قایل نہیں یہ سور کا گوشت کھاتے ہیں اور شراب بھی پیتے ہیں۔ شادی کی تقریبات میں ان کی بے پردہ عورتیں مردوں کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر آزادی سے رقص کرتی ہیں۔

تخلیق و آفرینش کو وہ پانچ مظاہر الٰہی یا قوتوں کا نتیجہ سمجھتے ہیں، جن کے نام یہ ہیں :- پیر پادشاہم - پیر بنیامین - سر داؤد - پیر ہمبر - پیر موسیٰ -

انسان میں وہ دو قوتوں کے قایل ہیں ایک عقل دوسرے نفس (شہوت)۔ ان کے ہاں مذہبی قیادت نسلاً بعد نسلٍ چلتی ہے، روحانی قاید کو پیر کہتے ہیں۔ اس کے نائبین جو پیر کی طرف سے مراسم مذہبی ادا کرتے ہیں دلیل کہلاتے ہیں اور وہ نائب جو حصوں کی تقسیم کرتے ہیں، خلیفہ کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔

یہ جماعت آٹھ طبقوں میں منقسم ہے :- ابراہیمی - داؤدی - میری - سلطان بابری - خاموشی - یادگاری - شاہ ایازی - خان تاشی۔

ان کا بیان ہے کہ بابا طاہر عریاں، ان کی بہن بی بی فاطمہ اور سید حمیری بھی انھیں کے جماعت کے افراد تھے۔ ان کی کتابیں کردستانی زبان میں لکھی ہوئی ہیں، جن میں بڑی خاص و اہم کتاب، کتاب سنجنار یا کتاب چہار ملک ہے۔

ان کے پیر شعبدہ باز بھی ہوتے ہیں اور ایک شعبدہ دکھتے ہوے کوئلوں پر بیٹھنے کا بھی ہوتا ہے۔

ان کے یہاں ایک ساتھ بیٹھ کر کھانے پینے کا بھی رواج ہے۔ وہ بھیڑ یا بیل کی قربانی کو بھی سب ساتھ مل کر کھاتے ہیں، بھیڑ کی قربانی کو قربان کہتے ہیں اور بیل کی قربانی کو گاو برآن۔

بکتاش اور قزلباش جماعتیں بھی قریب قریب اسی قسم کی ہیں، عام شیعہ انھیں خروس کش بھی کہتے ہیں، کیونکہ اپنے تین دن کے

روزے کے اختتام پر وہ مرغ ذبح کر کے کھاتے ہیں۔

ایران میں ان کا مرکز کرمان شاہ ہے۔ ہندوستان میں بھی ان کا وجود کہیں کہیں پایا جاتا ہے۔

نُصیری یہ جماعت بھی غالی شیعوں کی ہے اور اس باب میں اختلاف ہے کہ اس کا یہ نام کیوں پڑا۔ بعض اسے نصرانی کی تصغیر بتاتے ہیں (کیونکہ ان کے بعض مراسم نصرانیوں سے ملتے جلتے ہیں) بعض اسے نزینی کی بگڑی ہوئی صورت بتاتے ہیں جو شام کی عیسائی حکومت کا نام تھا، بعض اس کا تعلق ناصوریا سے ظاہر کرتے ہیں جو کوفہ کے قریب ایک گاؤں تھا۔ اس گاؤں کا یہ نام کیوں پڑا۔ اس کے متعلق بھی اختلاف ہے، لیکن غالباً یہ زیادہ صحیح ہے کہ یہ نام محمد بن نُصیر نمیری عابدی کی سکونت کی وجہ سے قرار پایا، کیونکہ نصیری جماعت کے افراد اپنے آپ کو پہلے مومنون اور نمیری ہی کہتے تھے، بعد کو ان کا نام نصیری ہو گیا۔

ابن نصیر، بصرہ کا ایک مشہور شخص تھا جو ۲۴۵ھ ہجری میں دسویں شیعی امام (علی نقی) کے مبلغ کی حیثیت سے رونما ہوا تھا۔

ان کے عقاید بہت عجیب ہیں۔ ان کے یہاں نظام عالم کا تعلق نورانی کروں یا سیاروں سے ہے جسے عالم کبیر نورانی کہتے ہیں۔ خدا جسے وہ عالم الغیب کہتے ہیں، مختلف ہستیوں کے اندر ظاہر ہوتا رہتا ہے جن کے مختلف نام اور مدارج انھوں نے مقرر کر رکھے ہیں۔ مثلاً:۔ رسم یا باب، صاعت، ناطق، معنیٰ وغیرہ۔

ان کا مذہب یکسر تاویلات کا مجموعہ ہے مثلاً نماز کے پانچ اوقات سے مراد محمدؐ، فاطمہؑ، حسنؑ، حسینؑ اور محسنؑ ہیں۔ اسی طرح ماہ صیام کے تیس دن کو تیس مردوں اور تیس راتوں کو تیس عورتوں سے منسوب کرتے ہیں اور زکوٰۃ سے وہ سلمان فارسی مراد لیتے ہیں۔

ولایت کے مسئلہ میں وہ علیؑ اور ان کی اولاد کے سوا سب کو مردود سمجھتے ہیں اور اُن کو بُرا بھلا کہتے ہیں۔ قرآن کے متعلق ان کا عقیدہ یہ ہے کہ رسول اللہؐ کو اس کی تعلیم جبرئیل کے نام سے سلمان ہی نے دی تھی۔ قمری حساب سے ان کے خاص تہوار یہ ہیں:۔ خطر، اضحیٰ، غدیر، مباہلہ، فراش، عاشورہ، ۹ ربیع الاول (یوم شہادت عمرؓ)، ۱۵ شعبان (یوم وفات سلمانؓ) کسی حساب سے وہ نوروز مہرجان، کرسمس وغیرہ بھی مناتے ہیں۔

اس جماعت میں ایران، شام، مصر، لبنان اور فلسطین وغیرہ کے مختلف قبایل کے لوگ شامل ہیں۔ شام میں جبل لقمان کا علاقہ جو ریاست علویہ کے نام سے موسوم ہے، زیادہ تر نصیریوں سے آباد ہے، اب سے ۳۰ سال قبل انکی آبادی یہاں تقریباً سوا دو لاکھ نفوس پر مشتمل تھی۔

۴۷ء = سالنامہ (ڈرامہ اصحاب کہف) نگار - مارچ ۶ر - اپریل ۸ر - مئی ۸ر - جون ۶ر - جولائی ۸ر - اگست ۸ر - ۵۱ء = سالنامہ (فراست التحریر) نگار - جولائی ۶ر - اگست ۸ر - ستمبر ۸ر - اکتوبر ۱۲ر - نومبر ۶ر - دسمبر ۶ر - ۵۲ء = فروری ۸ر - مئی ۸ر - جولائی ۸ر - ۵۳ء = فروری ۸ر - ۵۴ء = سالنامہ (تاریخ اسلامی ہند) ۸ر - اپریل ۸ر - مئی ۶ر - جون ۶ر - جولائی ۶ر - اگست ۶ر - ستمبر ۶ر - اکتوبر ۶ر - نومبر ۶ر - دسمبر ۶ر - ۳۹ء = سالنامہ (مصحفی نمبر) ۸ر - فروری ۶ر - مارچ ۶ر - اپریل ۸ر - مئی ۶ر - ۴۰ء = فروری ۶ر - مارچ ۶ر - اپریل ۶ر - مئی ۶ر - اکتوبر ۶ر - ۴۱ء = جون تا دسمبر ۶ر فی پرچہ - ۴۲ء = مارچ، اپریل، مئی، اگست، ستمبر، اکتوبر، نومبر ۶ر فی پرچہ - ۴۳ء = سالنامہ ریاض نمبر ۸ر - ۴۵ء = اپریل ۶ر - اگست ۶ر - ستمبر ۶ر - اکتوبر ۶ر - نومبر ۶ر - دسمبر ۱۲ر - ۴۶ء = فروری، مارچ (انتقاد نمبر) نگار - اپریل ۴ر - مئی ۴ر - جون ۶ر - جولائی ۴ر - اگست ۸ر - ستمبر ۱۲ر - اکتوبر ۱۲ر - دسمبر ۸ر - ۴۷ء = سالنامہ (ماجد دلین نمبر) نگار - مارچ ۱۲ر - اگست ۱۲ر - ستمبر ۸ر - اکتوبر ۶ر - نومبر ۱۲ر - ۴۸ء = سالنامہ (پاکستان نمبر) ۸ر - مارچ ۱۲ر - مئی ۱۲ر - جون ۱۲ر - جولائی ۱۲ر - اگست ۸ر - ستمبر ۱۲ر - نومبر ۱۲ر - دسمبر ۸ر - ۴۹ء = سالنامہ (افسانہ نمبر) نگار - مارچ ۱۲ر - اپریل ۶ر - مئی ۸ر - جولائی ۶ر - اگست ۶ر - ۵۰ء = سالنامہ (تنقید نمبر) نگار - مارچ ۱۲ر - اپریل ۸ر - مئی ۱۲ر - جون ۸ر - جولائی ۸ر - اکتوبر عہ ر - نومبر عہ ر - دسمبر عہ ر -

منیجر نگار لکھنؤ

ادبیات ملایا پر فارسی کا اثر

اسلام تیرھویں صدی عیسوی میں براہ ہندوستان ملایا پہونچا اور اسی کے ساتھ ادبیات فارسی سے بھی وہاں کے لوگ آشنا ہوئے۔ ہرچند ہندوستان سے آنے والوں میں ایرانیوں کی تعداد زیادہ نہ تھی، تاہم اس کا اثر بھی وہاں کے لوگوں پر ہوا۔ سب سے پہلے اسلام کا اثر و نفوذ جزیرۂ سوماترا کے شمالی بندرگاہ پسائی اور سمودرا میں ہوا اور یہیں سے دوسرے مقامات میں پھیلا۔

ابن بطوطہ نے سامودرا کے سربرآوردہ عمال میں چند ایرانیوں کا بھی ذکر کیا ہے، ان میں سے ایک نائب امیرالبحر تھا جس کا نام بہروز تھا۔ ایک قاضی بھی ایرانی ہی تھا امیر سید شیرازی اور ایک فقیہ تاج الدین نامی کا پتہ چلتا ہے جو اصفہان کا رہنے والا تھا۔

ان کے علاوہ عبداللہ بن محمد بن ابوجعفر العباسی بھی جو خاندان عباسی کے مبلغ کی حیثیت سے براہ دہلی یہاں آئے تھے اور ۷۰۴ھ میں یہیں دفن ہوئے۔

مشہور ہے کہ مالک ابراہیم سب سے پہلے عالم دین تھے جو جاوا آئے اور ۱۴۱۹ء میں یہیں ان کا انتقال ہوا۔ یہ کاشان کے رہنے والے تھے اور براہ ہندوستان یہاں آئے تھے۔

۱۴۲۰ء میں سامودرا میں ایک ایرانی حسام الدین کی قبر دریافت ہوئی جس پر سعدی کے بعض اشعار منقوش ہیں۔

پندرھویں صدی میں حکایت امیر حمزہ اور حکایت محمد حنفیہ کا ترجمہ ملایا زبان میں ہوا۔ طوطی نامہ کا ترجمہ بھی یہاں کی زبان میں کیا گیا جس کا ایک نسخہ جو ۱۶۰۰ء سے پہلے کا لکھا ہوا ہے، کتبخانۂ آکسفورڈ میں موجود ہے۔ کلیلہ دمنہ اور بختیار نامہ کا ترجمہ بھی ملایا میں پایا جاتا ہے۔

مذہبی کتابوں میں ایک کتاب نور محمدی کے بیان میں، روضۃ الاحباب کا ترجمہ ہے۔ اسی طرح حکایت یوسف و زلیخا اور تاج السلاطین کا ترجمہ بھی فارسی سے ملایا زبان میں کیا گیا، ایک اور کتاب ہزار سوال بھی فارسی سے ترجمہ کی گئی۔

ملایا کی شاعری میں فارسی اثرات کا پتہ چلتا ہے اور وہاں کے شعراء نے بھی معشوق کی پیشانی کو ہلال اور ابرو کو کمان سے تشبیہ دی ہے۔

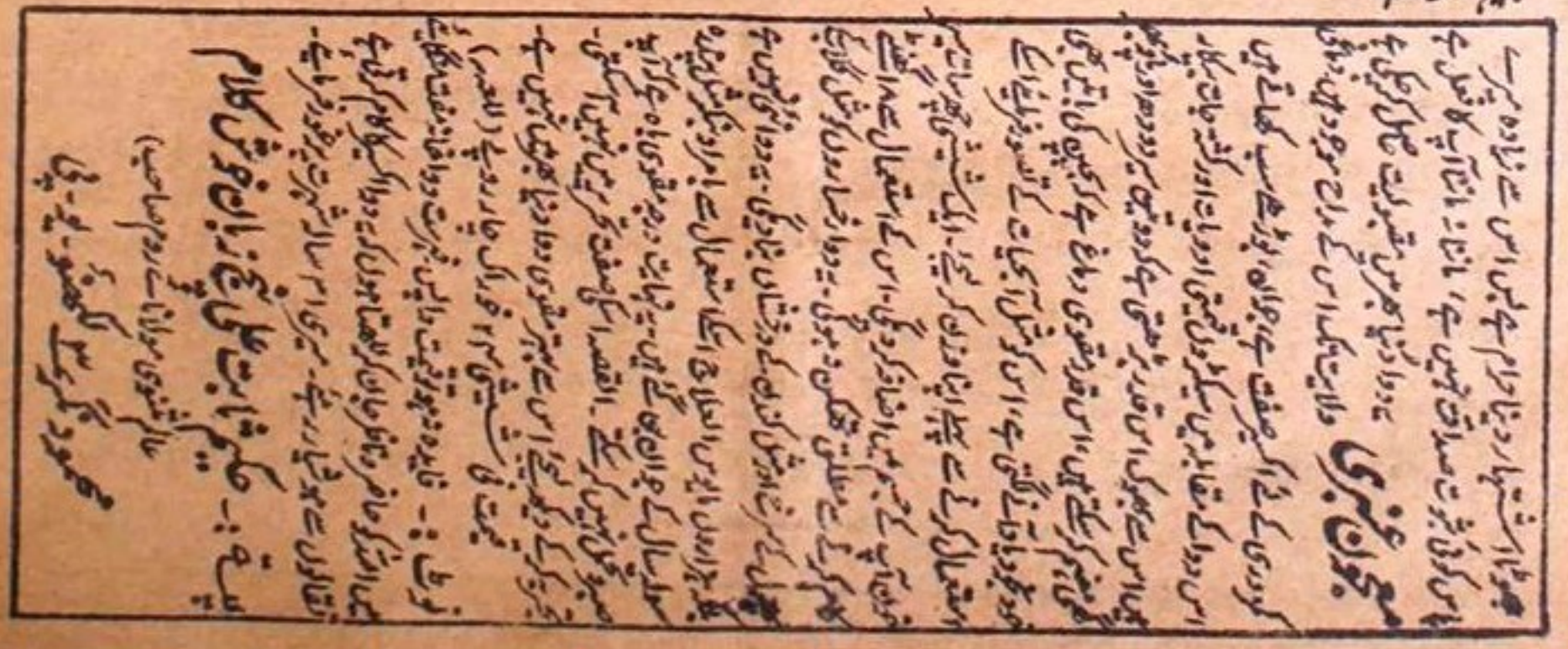

غیر متوقعات

ہیندیونا گوچی

ابھی تک وہ پوری طرح ہوش میں نہ آئی تھی کہ گھبرا کر چیخ اُٹھی ۔ "میرے بچہ کو لاؤ، میں اسے دیکھنا چاہتی ہوں" ڈاکٹر نے متفکرانہ انداز سے نرس کی طرف دیکھا اور کہا کہ "کیا کیا جائے مجبوری ہے، جاؤ بچہ کو لاکر اسے دکھا دو"

تھوڑی دیر کے بعد ایک خوبصورت بچہ اس کی آغوش میں تھا۔ وہ اس کے پیارے پیارے چہرہ کو محبت بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی کہ دفعتاً اس کا دل دھڑکنے لگا اور وہ گھبرا گئی کیونکہ جب اسکی کنپٹی کی طرف نگاہ گئی تو دیکھا کہ بچہ کے کان نہ تھے۔

بچہ بڑا ہوکر مدرسہ جانے لگا، وہ بہت ذہین تھا اور کھیل کود، پڑھنے لکھنے میں اپنے تمام ساتھیوں میں اول رہتا تھا، کان نہ تھے لیکن اس کی سماعت میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔

ایک روز روتا ہوا اپنی ماں کے پاس آیا اور بولا "اے ماں، آج میرے ایک ساتھی لڑکے نے مجھ سے کہا کہ میری پیدائش ناقص ہوئی ہے، میرے باپ کو آتشک تھی اور اسی لئے میرے کان غائب ہو گئے ہیں"

ماں نے اس کو تسلی دی اور بولی کہ "وہ جھوٹ کہتا ہے، تم رنج نہ کرو"

لیکن اُس دن سے اس کے ماں باپ کو بڑی فکر پیدا ہوگئی اور دونوں بہت افسردہ رہنے لگے۔

لڑکا بڑھتا رہا، تعلیم پاتا رہا، یہاں تک کہ وہ مدرسہ کے آخری درجہ تک پہونچ گیا اور امتحان میں کامیاب ہونے پر اسے اول انعام ملا، لیکن والدین کا اضمحلال کسی طرح کم نہ ہوا۔

وہ اسے ٹوکیو لے گئے اور ایک ڈاکٹر سے مشورہ کیا تو اس نے کہا کہ "جراحی سے اس کا یہ عیب دور ہو سکتا ہے، بشرطیکہ کوئی شخص اپنے کان دینے پر آمادہ ہو جائے"

ایک ہفتہ کے بعد اس کے والدین نے اس سے کہا کہ "لو خوش ہو جاؤ، اب تمہارا یہ عیب دور ہو جائے گا، ایک شخص اپنے کان دینے پر آمادہ ہو گیا ہے۔

چنانچہ اسی ہفتہ ٹوکیو کے شفاخانے میں عمل جراحی سے دونوں کان اس کے کنپٹی پر پیوند کر دئے گئے اور جب وہ وہاں سے شفایاب ہوکر کالج پہونچا تو سب کو دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی۔

اس نے اپنے والدین سے دریافت کیا کہ "وہ کون شخص تھا جس نے اس کے لئے اتنی بڑی قربانی گوارا کر لی۔ لیکن انھوں نے کہا کہ "یہ بات ہم نہیں بتا سکتے، کیونکہ ہم نے اس راز کے چھپانے کی قسم کھائی ہے"

باپ نے اپنے بیٹے سے کہا کہ "تمہاری ماں کی آخری وصیت یہ تھی کہ دفن ہونے سے پہلے تم اس کے چہرہ کو بوسہ دینا"۔
لڑکا اپنی ماں کی میت کے پاس گیا اور آہستہ آہستہ اس کے چہرہ سے چادر ہٹائی تاکہ اس کو آخری بوسہ دے سکے، لیکن اسکی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ اس کے دونوں کان غائب ہیں۔
لڑکے نے انتہائی تاثر کے ساتھ کہا کہ "آج مجھے معلوم ہوا کہ میری ماں نے کیوں بالوں میں کنگھی کرنا چھوڑ دی تھی اور اپنے بال شانہ وگردن تک بکھرائے رکھتی تھی"۔

یہ لڑکا جو بغیر کان کے پیدا ہوا اور جس کی یہ بدنمائی دور کرنے کے لئے ماں نے اپنے دونوں کان اس کی نذر کر دئے وہ تھا کہ جب اس کے ۲۲ سال بعد اس کا انتقال ہوا تو شاہ جاپان نے اس کا ماتم کیا، اور ملک بھر میں اس کی یادگاریں قایم کی گئیں، کیونکہ یہی وہ پہلا شخص تھا جس نے زرد بخار کی دوا دریافت کی اور خود اسی مرض میں مبتلا ہوکر جان دی۔
لیکن اس سے زیادہ اہم خدمت اس کی یہ تھی کہ اسی نے سب سے پہلے آتشک کے جراثیم دریافت کئے جس پر اسے نوبل پرائز دیا گیا۔
اس لڑکے کا نام "ہنیدیو ناگوچی" تھا جو بیسویں صدی کا بہترین "ماہر جراثیم" مانا جاتا ہے۔

والٹیر

والٹیر، فرانس کا مشہور فیلسوف ونقاد، سود خواروں میں بھی اول درجہ کا سود خوار سمجھا جاتا تھا اور عجیب ترکیب سے اس نے سودی روپیہ جمع کیا تھا۔
جب لوگ اس سے روپیہ قرض لینے آتے تو وہ کہتا کہ میں اصل رقم کبھی واپس نہ لوں گا، لیکن جب تک میں زندہ ہوں دس فیصدی کے حساب سے سود ادا کرتے رہو۔ چونکہ وہ بہت ضعیف جثہ کا انسان تھا اور بیمار ہی بنا رہتا تھا، اس لئے لوگ اس زیادہ سود کو بھی گوارا کر لیتے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ یہ تو قبر میں پاؤں لٹکائے ہوئے ہے، معلوم نہیں کس دن مرجائے۔
اگر کوئی شخص اتنا سود دینے میں کچھ تامل کرتا نظر آتا تو وہ مصنوعی طور پر کھانسنے اور کراہنے لگتا جس سے قرض خواہ کو یقین ہوجاتا کہ یہ زیادہ عرصہ تک زندہ رہنے والا نہیں اور وہ دس فی صدی سود منظور کر لیتا۔
لیکن حیرت کی بات ہے کہ یہی والٹیر جسے لوگ زندہ درگور سمجھا کرتے تھے۔ ۸۴ سال تک زندہ رہا اور اس نے لاکھوں روپیہ صرف سود سے حاصل کیا۔

قول فیصل

جس میں ملک کے مشہور مفکر و بلند خیال شاعر علی اختر اختر حیدرآبادی نے جوش کی مشہور نظم "حرف آخر" کو سامنے رکھ کر اس کے تمام خیالات کی تردید کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ انسان لاکھ ترقی کرے کتنی ہی عقل و فراست سے کام لے، لیکن ایک وقت ایسا آتا ہے جب اس کو خدا کے سامنے سر جھکانا ہی پڑتا ہے۔ اس نظم میں ۱۰۰۰ سے زیادہ اشعار ہیں اور شیطان و شاعر کے مکالمہ کے ذریعہ سے رموز کائنات اور اسرار حیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ فنی حیثیت سے اختر کا یہ وہ عظیم الشان کارنامہ ہے جسے ان کے شاعرانہ عروج کے ثبوت میں بآسانی پیش کیا جا سکتا ہے۔ شروع میں حضرت نیاز فتحپوری کا مقدمہ بھی شامل ہے۔ کاغذ ۲۸ پونڈ دبیز، گردپوش رنگین، قیمت دو روپیہ

منیجر نگار لکھنؤ

مختصرات

دُنیا کے مختلف ملکوں میں انسانی دانت سے متعلق بعض توہمات اب بھی پائے جاتے ہیں۔ مثلاً اٹلی میں اب بھی یقین کیا جاتا ہے کہ اگر کسی کے دانت کھلے کھلے ہیں تو وہ ضرور اقبال مند ہوگا۔

اگر کوئی بچہ ایسا پیدا ہو جس کے منہ میں کوئی دانت پایا جاتا ہو تو وہ بہت منحوس خیال ہوتا ہے اور افریقہ کے وحشی قبایل ایسے بچہ کو نہایت بیرحمی سے فوراً ہلاک کر ڈالتے ہیں۔

کرۂ زمین ۲ر اکتوبر ۱۹۴۹ء کو ایک بڑے خطرہ سے بال بال بچ گیا۔ اس تاریخ کو ایک جسم سیاہ چاند کے سامنے مشرق سے مغرب کی طرف ڈیڑھ سکنڈ کے اندر گزر گیا۔

یہ جسم بیضوی شکل کا تھا اور بغیر دوربین کے بھی نظر آتا تھا۔ منجمین امریکہ نے رات کو ساڑھے نو بجے اس کا مشاہدہ کیا۔ یہ کسی کرہ کا ٹکڑا تھا جو اس سے علٰحدہ ہو کر ۲۰ کیلومیٹر فی سکنڈ کے حساب سے حرکت کر رہا تھا اور اگر اتفاقاً یہ کہیں زمین سے ٹکرا جاتا تو زمین تباہ ہو جاتی

پرتگال میں ایک قوم ہے جسے برزیل کہتے ہیں، یہ پرتگال کے بڑے علاقہ پر حاوی ہیں اور اپنی حماقت کے لحاظ سے بہت بدنام ہیں۔

دوسری جنگ عظیم سے ایک دو سال قبل جب لڑائی کا خطرہ بڑھتا جا رہا تھا، حکومت پرتگال نے چاہا کہ فرانس کی ماژینو لائن کی طرح خود بھی مدافعت کے لئے ایک جدید خط دفاع قایم کرے، چنانچہ کام شروع ہو گیا اور بہت سے زمین دوز قلعے تعمیر کر کے توپیں ان پر نصب کر دی گئیں۔ لیکن جب پرتگالی حکومت کے فوجی افسران اس کے مشاہدہ کے لئے گئے تو ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی، کیونکہ جتنے قلعے بنائے گئے تھے ان سب کی توپوں کا رُخ خود پرتگال ہی کی طرف تھا اور بجائے اس کے کہ دشمن کے خلاف ان سے کام لیا جاتا، خود دشمن ان سے کام لیکر پرتگال کو تباہ کر سکتا تھا۔ بڑی فکر ہوئی کہ کیا کیا جائے۔ ان قلعوں کو مسمار بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کیونکہ انکی طیاری پر بہت روپیہ خرچ ہوا تھا۔ آخر کار حکومت اسپین سے گفتگو شروع ہوئی اور نصف لاگت پر یہ تمام قلعہ بندیاں اس کے ہاتھ فروخت کر دی گئیں، کیونکہ وہ ان سے کام لے سکتا تھا۔

امریکہ کے ایک شہر آرکانزاس میں ایک دولتمند شخص گردم کلک کو اپنے مال و متاع کے تصرف سے روک دیا گیا تھا کیونکہ اسکے ہوش و حواس کی درستی کی طرف سے اشتباہ تھا۔

ایک دن اس نے اپنے دوستوں کو جن میں وکلاء اور عدالتوں کے جج بھی شامل تھے، دعوت دی کہ وہ اس کی نئی بیوی سے آکر مل جائیں۔

جب یہ سب جمع ہو گئے تو وہ ان سب کو اصطبل لے گیا، جہاں اس کی کئی گھوڑیاں بندھی ہوئی تھیں اور ان میں سے ایک گھوڑی کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ میری نئی بیوی ہے۔

امریکہ میں قدیم سے یہ قانون چلا آتا ہے کہ "مرد ہر ایک زندہ مادہ سے شادی کر سکتا ہے" اور اس میں کوئی تخصیص انسان وحیوان کی نہیں ہے۔ اسی کے ساتھ چونکہ قانوناً بیوی کی تمام دولت مرد کی ملکیت سمجھی جاتی ہے، اس لئے گروم کو حق پہونچتا تھا کہ یہ گھوڑی گھوڑ دوڑ میں جو کچھ جیتے وہ اسے حاصل کرے۔

جب یہ معاملہ عدالت میں آیا تو اس نے اس نکاح کو تو ناجایز قرار دیا لیکن اسی کے ساتھ اُسے اپنے مال ومتاع پر تصرف کی بھی اجازت دیدی کیونکہ جو شخص کسی متروک قانون سے فایدہ اُٹھانے کی اتنی عقل رکھتا ہے وہ ہوش وحواس سے بیگانہ شمار نہیں کیا جا سکتا۔

آپ کو معلوم ہے کہ ولایت میں ایک شہری و دیہاتی عورت کی کیا پہچان ہے، ۔ شہری عورت جب ہوا تیز چلتی ہے تو فوراً اپنی ٹوپی کو سنبھالتی ہے اور دیہاتی عورت اپنے دامن کو۔

سان فرانسسکو کانفرنس میں شرکت کے لئے ایک معمر چینی اخبار نویس بھی گیا تھا۔ جب وہ وہاں سے واپس آنے لگا تو اخباروں کے نمایندوں نے اس سے دریافت کیا کہ "آپ کو امریکہ میں عجیب چیز کونسی نظر آئی"۔

اس نے جواب دیا کہ "اہل امریکہ کی آنکھیں بہت عجیب نظر آئیں جو سیدھی اور بالکل غیر فطری ہیں"

ملکۂ "اوزنی" نپولین سوم شاہنشاہ فرانس کی بیوی، ایک جوتا کبھی دو بار نہ پہنتی تھی۔

ملکۂ "الزبتھ (انگلستان کی بے شوہر ملکہ) لباس کی بہت شایق تھی اور روز نیا لباس پہنتی تھی۔ چنانچہ اپنی ۴۰ سال کی حکومت کے بعد جب اس کا انتقال ہوا تو ۲ ہزار جوڑے اپنے بعد چھوڑ گئی۔

کیتھرائن کبیر (ملکۂ روس) ہر وقت اپنا بدن دبوایا کرتی تھی۔

ملکۂ وکٹوریا اس ڈر سے کہ مبادا اس کے جاذب (بلاٹنگ پیپر) کے نشانات سے لوگ اس کی خفیہ وسیاسی مراسلت کو پڑھ سکیں، ہمیشہ سیاہ رنگ کا جاذب استعمال کرتی تھی۔

ملکۂ "آن بولین" ہنری ہشتم کی بیوی ہمیشہ اپنے شوہر کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر باہر نکلتی تھی تاکہ لوگوں کو پتہ نہ چلے کہ اسکے ہاتھوں میں چھ اونگلیاں تھیں۔

"آن" ملکۂ روس نے ایک روز کسی بات پر شاہزادہ سے خفا ہو کر حکم دیا کہ اس کو مرغی بنایا جائے۔ چنانچہ ایک ٹوکرے میں گھاس رکھ کر انڈے رکھدئے گئے اور شاہزادہ کو حکم دیا گیا کہ اس ٹوکرے میں انڈوں پر بیٹھے اور مرغی کی سی آواز نکالے۔

مئی کی ایک دوپہر

اب کوئی چیز دل آویز و فسوں کار نہیں

شام ضَو ریز نہیں، صبح پُر انوار نہیں — سروِ آزاد نہیں، نرگسِ بیمار نہیں
رونقِ صحن و جمالِ در و دیوار نہیں — دولتِ عشق نہیں، نعمتِ دیدار نہیں

اب کوئی چیز دل آویز و فسوں کار نہیں

کل یہاں خلد سے ہوتا تھا شگوفوں کا نزول — آج "تکلیفِ نظر حدِ نظر تک ہے ببول
عرصۂ دہر ہے پژمردہ و بے کیف و ملول — عیشِ گلزار نہیں، عشرتِ کہسار نہیں

اب کوئی چیز دل آویز و فسوں کار نہیں

گوشہ گوشہ ہے یہاں "حلقۂ صد کام نہنگ" — دلِ ہر ذرّہ میں پیوست ہیں صرصر کے خدنگ
کونسا پھول نہیں نوحہ گرِ رامش و رنگ — کونسی شاخ ہے گلشن میں جو تلوار نہیں

اب کوئی چیز دل آویز و فسوں کار نہیں

ہوگیا مَے سے تہی رطلِ گراں اے ساقی — اب کہاں وہ مری "فردوسِ رواں" اے ساقی
کون سی آنکھ نہیں دجلہ فشاں اے ساقی — کونسا دل غمِ گیتی سے گراں بار نہیں

اب کوئی چیز دل آویز و فسوں کار نہیں

اب وہ سوزِ فلک افروز نہیں تاروں میں — اب وہ پہلا سا ترنّم نہیں فوّاروں میں
نگہِ شوق بھٹکتی ہے سمن زاروں میں — اب ہیں کہنے کو سمن زار۔ سمن زار نہیں

اب کوئی چیز دل آویز و فسوں کار نہیں

ہیں صنوبر کے لرزتے ہوئے سائے خاموش — تتلیاں رقص کناں ہیں نہ ہوا بادہ فروش
زندگی سر بگریباں ہے، تمنّا روپوش — لذّتِ شوق نہیں، مستیِ بیدار نہیں،

اب کوئی چیز دل آویز و فسوں کار نہیں

اب نہیں موجِ نظر حیرتیِ "سیم سمن" چار سو یاس کے پرچم ہیں، امیدوں کے کفن
اوس کی بوند پہ رقصاں تو ہے سورج کی کرن آہ لیکن یہ کرن زرد ہے گلنار نہیں
اب کوئی چیز دل آویز و فسوں کار نہیں

جستجوئے گل و بلبل میں پریشاں ہے نسیم اب کہاں شبنم آوارہ میں روحِ تسنیم
اب نہ وہ سبزۂ نورستہ نہ غنچوں کی شمیم اب وہ طوطی نہیں، درّاج نہیں، سار نہیں
اب کوئی چیز دل آویز و فسوں کار نہیں،

اب نہ وہ موسم نغمہ ہے نہ وہ فصلِ شباب غنچگی رُخ سے اُلٹنے بھی نہ پائی تھی نقاب
اُڑ گیا قافلۂ لالہ و نسرین و گلاب شعلۂ ساز نہیں، ابرِ گہربار نہیں
اب کوئی چیز دل آویز و فسوں کار نہیں!!

افسر سیمابی

اکرم دھولیوی :-

تری طلب کا تقاضا ہے دل کی بے تابی خدا کرے کہ نہ آئے کبھی قرار مجھے
جنوں کے جوش میں تجھ کو نہ بھول جاؤں کہیں بنا نہ شیفتۂ ذوقِ انتظار مجھے
اُڑا مذاق نہ میری نیاز مندی کا دلا یقین نہ وعدہ کا بار بار مجھے
سکون دل کی کہاں اور پھر کوئی صورت ترا خیال نہ رکھے جو بے قرار مجھے
مزہ تو جب ہے کہ تازہ نیاز الفت میں کچھ اختیار تجھے ہو کچھ اختیار مجھے
مری نگاہ میں ہیں گردشیں زمانے کی اک انقلاب کا ہر دم ہے انتظار مجھے

بہا رہا ہوں جو میں اپنا خونِ دل اکرم
غم وفا کو بنانا ہے یادگار مجھے،

ملکِ خطا کے شہزادے

دُنیا میں کیا اندھیر ہو رہا ہے، اس کی دردناک داستان اگر آپ کو سننا ہے تو وصی احمد بلگرامی فانی بی، اے کی زبان سے سنئے جو اپنی مخصوص طرزِ تحریر اور زورِ بیان کے لحاظ سے جواب نہیں رکھتے۔ قیمت بارہ آنے۔

منیجر نگار لکھنؤ

صبح نشور

ابھی تو کرتا ہے تکمیل "دین و فن" ایدوست
لہو اگلنا ہے گیتی کے ماہ پاروں کو
نسیمِ باغ کو بادِ سموم ہونا ہے
ابھی دہنا ہے شبنم فشاں بہاروں کو
زمیں سے آتشیں سیلاب کو اُبلنا ہے
لہو میں کھینا ہے اپنا سفینہ لالے کو
ابھی تو ساغرِ امرت میں زہر بھرنا ہے

ابھی بسانے ہیں آبادیوں میں ویرانے
زمیں پہ جھکنا ہے افلاکیانِ خود بیں کو
حریمِ غنچہ کو محرابِ برق ہونا ہے
مہ و ستارہ کو ہونا ہے جل کے خاکستر
ابھی زمین کو جننا ہے زلزلے، سیلاب
"خروشِ زمزمہ" کو "بانگِ صور" ہونا ہے
حریر پوشوں کو فولاد و سنگ ہونا ہے

خرد کو جہل کا حلقہ بگوش ہونا ہے
یہ دین و عقل و کتاب و ہنر کے آئینے

ابھی "فرشتوں" کو بننا ہے "اہرمن" ایدوست
زمیں پہ ٹوٹ کے آنا ہے چاند تاروں کو
"پیمبروں" کو "ظلوم و جہول" ہونا ہے
بکھیرنا ہے ابھی آگ برف زاروں کو
ابھی اس آنچ میں انسانیت کو گلنا ہے
ابھی اندھیروں میں ہونا ہے گم اجالے کو
خضر کو موت کے ظلمات سے گزرنا ہے

ابھی چمن میں کچھ آتشکدے ہیں سلگانے
یہ جُرعے زہر کے پینے ہیں اہلِ نوشیں کو
جہانِ زیست کو شعلے میں غرق ہونا ہے
نگارِ وقت کو رہنا ہے صدیوں خاک بسر
ابھی اُٹھانا ہے چہرے سے حادثوں کے نقاب
ہر ایک صبح کو "صبحِ نشور" ہونا ہے
ثبات و صلح کو آشوبِ جنگ ہونا ہے

ابھی "رسولوں" کو "ایماں فروش" ہونا ہے
ان آئینوں کو ابھی پاش پاش ہونا ہے

طلوع ہونا ہے مشرق سے تیرگی کو ابھی
ہزار ہا سال ترسنا ہے روشنی کو ابھی

فضا ابن فیضی

شفا گوالیاری :۔

روا رکھا یہاں تک احترامِ عاشقی میں نے
ہنسی آئی کبھی تو آنسوؤں کو سونپ دی میں نے

مچی ہے آج تک ہلچل سی دنیائے پرستش میں
کیا تھا ایک سجدہ ماورائے بندگی میں نے

ملیں ایسی بھی راہیں مجھ کو اکثر راہِ الفت میں
کہ خود کو اے شفا گھبرا کے خود آواز دی میں نے

ضیائے ماہ و نجوم بھی اب فریبِ جلوہ نہ دے سکے گی
نگاہِ جلوہ طلب کو ہر سو، اب اپنی ہی روشنی ملے گی

سبق لے! منظرِ گورِ غریباں دیکھنے والے
چراغوں کو ترستے ہیں چراغاں دیکھنے والے

قفس میں بھی تجھے رہنا کہیں دو بھر نہ ہو جائے
ارے مُڑ مُڑ کے او سوئے گلستاں دیکھنے والے

تو جسے ذرّہ سمجھ کر کر رہا ہے پائمال،
دیکھ! اس ذرے کے سینے میں کہیں دنیا نہ ہو

شبِ غم رونے والا روتے روتے سو گیا شاید
جبینِ گل پہ شبنم کی نمی دیکھی نہیں جاتی

ارے او بیکسی پہ رونے والے کچھ خبر بھی ہے
وہی ہے زندگی، جو زندگی دیکھی نہیں جاتی

شبِ غم دیکھتا رہتا ہوں، یوں تو سیکڑوں منظر
مگر پچھلے پہر کی چاندنی دیکھی نہیں جاتی

ذوقِ سجدہ کامراں ہونے نہیں دیتا ہمیں
اب جبیں سے بھی بچا کر آستاں ڈھونڈھیں گے ہم

اِک نئی بنیاد ڈالیں گے تجسس کی شفا
ہر غبارِ کارواں میں کارواں ڈھونڈھیں گے ہم

نہ ہوگا پاس رہ کر امتحاں مشقِ تصور کا
وہ جتنا دور ہو سکتا ہوا اُتنا دور ہو جائے

لبوں پہ دم ہے کسی کا، کوئی سر بالیں،
شفا حیات کا دامن پکڑ کے آئی ہے

مطمئن دل ان کی اُلفت سے مگر آنکھیں پر آب
آہ دیوانے کی دنیا، آہ دیوانے کا خواب

دھڑکتے دل سے شفا تک رہا ہوں یوں تارے
کسی نے جیسے کہا ہو کہ "آ رہا ہوں میں"

انجم رضوانی :۔

ہوتے ہیں بڑے قسمت کے دھنی جو یہ صدمے سہہ جاتے ہیں
طوفانِ حوادث میں ورنہ اچھے اچھے بہہ جاتے ہیں

دو اشک کسی کے دامن پر ٹپکا کر چپ رہ جاتے ہیں
یوں بات جو کہنا ہوتی ہے کہنے والے کہہ جاتے ہیں

اس یاس و الم کی دنیا میں اور اسکے سوا کیا رکھا ہے
کچھ دکھ دینے کو آتے ہیں کچھ رنج و تعب سہہ جاتے ہیں

محویتِ دل کا حال یہ ہے انجم کہ نہیں اپنی بھی خبر
شاید یہ وہی منزل ہے جہاں ہوش اور خرد رہ جاتے ہیں

رعایتی قیمت

مجموعۂ استفسار و جواب

کی تیسری جلد

ضخامت ۵۰۰ صفحات۔ جسکی قیمت علاوہ محصول تین روپیہ ہے لیکن اب آپ کو معہ محصول صرف دو روپیہ میں مل سکتی ہے۔ منیجر نگار

گوہر

جناب نظیر جمیلی ام۔ اے کے قلم سے

یہ کوئی من گھڑت کہانی نہیں ہے بلکہ واقعہ ہے صوبۂ بہار کا اور ایسا دردناک واقعہ ہے کہ اسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ایک معمر شوہر کی جوان بیوی اور اسکے سوتیلے جوان بیٹے کی داستان معاشقہ ہے اور اس قدر دلچسپ انداز بیان میں کہ پڑھنے والے پر محویت طاری ہو جاتی ہے۔ قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول۔ منیجر نگار

مرزا شوق لکھنوی کا تنقیدی مطالعہ

(از پروفیسر خواجہ احمد فاروقی)

مرزا شوق، جانعالم واجد علی شاہ کے لکھنؤ کے شاعر تھے۔ انکی مثنوی کا تنقیدی مطالعہ نہ صرف ادب کے محرکات اور میلانات کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے بلکہ اس تہذیبی ماحول کو جاننے کے لئے بھی جب یہ معلوم ہوتا تھا کہ حکم قضا کو جام شراب کی گردش سے پھیر دیا گیا ہے۔ قیمت علاوہ محصول ڈیڑھ روپیہ۔ منیجر نگار

تذکرۂ معرکۂ سخن

اپنی نوعیت کا بالکل پہلا تذکرہ ہے جس میں تمام ان اعتراضات کو پیش کیا گیا ہے جو شعراء فارسی و اردو کے کلام پر کئے گئے ہیں اور اسی کے ساتھ اعتراضات کے جوابات بھی دئے گئے ہیں اور ان پر محاکمہ بھی کیا گیا ہے۔ جن شعراء کا اسمیں ذکر کیا گیا ہے انکے حالات بھی دیدئے گئے ہیں، وہ حضرات جو فن شعر کے نکات و رموز سے واقف ہونا چاہتے ہیں، انکے لئے یہ کتاب بڑا بیش قیمت ذخیرہ ہے۔ صرف چند جلدیں باقی رہگئی ہیں۔ قیمت معہ محصول چار روپیہ آٹھ آنے۔ کمیشن نہیں دیا جائیگا۔ منیجر نگار

کیل چھائیوں پھوڑے پھنسیوں نجاست پائے کیلئے

صافی

استعمال کیجئے

قیمت فی شیشی صرف ایک روپیہ ہر جگہ بکتی ہے

ہمدرد دواخانہ وقف دہلی

دی مغل لائن لمیٹڈ

(ہندوستان کی سب سے پرانی جہاز ران کمپنی)

خاص حج سروس

مغل لائن نہایت مسرت کے ساتھ اعلان کرتی ہے کہ امسال عازمین حج بیت اللہ کے لئے رمضان سے قبل جہازوں کی روانگی کا خاص انتظام کیا ہے۔ رمضان کے بعد روانہ ہونے والے جہازوں میں جگہ نہ ملنے کی وجہ سے جو مایوسی ہوتی ہے اس سے بچنے کے لئے غازمین حج کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ مندرجۂ ذیل جہاز کی روانگی سے فایدہ اُٹھائیں۔ اس جہاز میں جگہ بھی کافی ہے اور انکا کرایہ بھی رمضان کے بعد جانے والے جہازوں کے کرایہ کے مقابلہ میں کم ہے۔

(ایس۔ ایس۔ رضوانی —— وزن ۵۴۴۸ ٹن)

۲۵ مئی کے قریب بمبئی سے روانہ ہوگا

جہاز کی روانگی کی صحیح تاریخ کا اعلان بعد میں کیا جائے گا

کرایہ بمبئی تا جدّہ اور واپسی مع شرح خوراک، محصولات جدّہ، قرنطینہ کامران اور جدّہ کی کشتی

کرایہ حسب ذیل ہے:-

	کرایہ جہاز	خوراکی	محصولات جدّہ	قرنطینہ کامراں	کرایہ کشتی	مجموعی رقم
پہلا درجہ	۹۷۶ روپے	۱۷۵ روپے	۶۶ روپے ۱۲ آنے	۴ روپے	۴ روپے	۱۲۲۵ روپے ۱۲ آنے
عرشہ (قبل رمضان)	۳۳۱ روپے	۵۸ روپے	۶۶ روپے ۱۲ آنے	۴ روپے	۴ روپے	۴۶۳ روپے ۱۲ آنے
عرشہ (بعد رمضان)	۳۵۷ روپے	۵۸ روپے	۶۶ روپے ۱۲ آنے	۴ روپے	۴ روپے	۴۸۹ روپے ۱۲ آنے

اہم اطلاع عازمین حج کے پاس بین الاقوامی فارم پر ہیضہ اور چیچک کے ٹیکہ لگوانے کا سرٹیفکٹ ہونا چاہئے۔ ہیضے کے سرٹیفکٹ میں یہ درج ہونا ضروری ہے کہ عازمین حج نے سات روز کے وقفہ سے ہیضہ کے ۲ دو انجکشن لئے ہیں اور یہ کہ دوسرا انجکشن بمبئی سے روانگی کی تاریخ سے کم از کم سات روز قبل لیا گیا ہے۔ اسی طرح چیچک کے سرٹیفکٹ میں یہ اندراج ہونا چاہئے کہ جہاز کی روانگی کی تاریخ سے کم از کم چودہ دن قبل چیچک کا ٹیکہ لگوایا گیا ہے۔ یہ سرٹیفکٹ مقررہ "انٹرنیشنل فارموں" پر مقامی میونسپلٹی کے محکمہ حفظان صحت کے حکام سے حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ ہیضہ کے سرٹیفکٹ ۶ ماہ تک اور چیچک کے سرٹیفکٹ تین سال تک کام دے سکتے ہیں۔

عازمین حج کو چاہئے کہ وہ ابھی سے ہیضہ اور چیچک کے ٹیکے لگوا کر سرٹیفکٹ تیار رکھیں

نشستیں محفوظ کرائیے! رمضان سے پہلے اور بعد روانہ ہونے والے جہازوں کی نشستیں محفوظ کی جا رہی ہیں عازمین حج کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ بلا تاخیر اپنے نام ہمارے ہاں درج کرالیں تاکہ بعد میں سعادت حج سے محروم نہ ہونا پڑے۔ درخواست میں مندرجۂ ذیل تفصیلات کا ہونا ضروری ہے

۱۔ ہر ایک عازم حج کا پورا نام ۲۔ والد یا شوہر کا نام ۳۔ جنسیت یعنی مرد یا عورت ۴۔ عمر ۵۔ درخواست بھیجنے والے کا پورا پتہ خوشخط

۶۔ کس درجہ کا ٹکٹ درکار ہے کن تاریخوں میں سفر کا ارادہ ہے؟ اگر ساتھ میں بچے ہوں تو انکا نام وغیرہ بھی درج کرنا ضروری ہے خواہ وہ شیر خوار ہی کیوں نہ ہوں۔

نشستیں محفوظ کرانے کے لئے لکھئے:-

ٹرنر مارلیسن اینڈ کمپنی لمیٹڈ

منیجنگ ایجنٹس:- دی مغل لائن لمیٹڈ

۱۶- بنک سٹریٹ بمبئی

تار کا پتہ "MOGUL" BOMBAY

مکتوبات نیاز

تین حصوں میں اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو جذبات نگاری، سلاست بیان رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فن انشا میں بالکل پہلی چیز ہیں اور جن کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں، اس ایڈیشن کو میں پہلے اڈیشن کی غلطیوں کو دور کیا گیا ہے اور ۲۸ پونڈ کاغذ پر طباعت ہوئی ہے

قیمت ہر حصہ کی چار روپیہ علاوہ محصول

شہاب کی سرگذشت

حضرت نیاز کا دو عدیم النظیر افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے اس کی زبان و تخیل اسکی نزاکت بیان اسکی بلندی مضمون اور اسکی انشا رحالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہنچتی ہے۔ یہ اڈیشن نہایت صحیح اور خوشخط ہے

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک بہت مفید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کر کے انکی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے اردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے جسمیں ہندی کتاب کے بہترین نمونے نظر آئے ہیں،

قیمت بارہ آنے علاوہ محصول

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے دو علمی مضامین شامل ہیں :-

(۱) چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ

(۲) مادیین کا مذہب۔

نہایت مفید دلچسپ کتاب ہے

قیمت

ایک روپیہ

علاوہ محصول

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کی تمام رقت بخش کیفیات اس کے ایک جملہ میں موجود ہیں یہ انشا اپنے پلاٹ اور انشا کے لحاظ سے اسقدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اسکی نظیر نہیں مل سکتی۔ تازہ اڈیشن نہایت صحیح و خوش خط سرورق رنگین قیمت بارہ آنہ

علاوہ محصول

فراست الید

مولفہ نیاز فتحپوری کے مطالعہ سے ایک شخص آسانی ہاتھ کی شناخت اور اسکی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل سیرت عروج و زوال موت و حیات صحت و بیماری ثروت و نیکنامی پر صحیح پیشین گوئی کر سکتا ہے

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

نقاب اٹھ جانے کے بعد

نیاز فتحپوری کے تین افسانوں کا مجموعہ جسمیں بتایا گیا ہے کہ ہمارے ملک کے ادیان طریقت و علما اکرام کی اندرونی زندگی کیا ہے اور ان کا وجود ہماری معاشرت و اجتماعی حیات کے لیے کس درجہ مہلک ہے، زبان، پلاٹ و انشا کے لحاظ سے جو مرتبہ ان افسانوں کا ہے وہ صرف دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ قیمت آٹھ آنے

علاوہ محصول

مذاکرات نیاز

یعنی حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے ایک بار اسکو شروع کر دینا اخیر تک پڑھ لینا ہے۔ یہ بھی جدید اڈیشن ہے جسمیں صحت اور نفاست کاغذ و طباعت کا خاص اہتمام کیا گیا ہے

قیمت

ایک روپیہ

علاوہ محصول

انتقادیات (۲ حصے)

حضرت نیاز فتحپوری کی انتقادی مقالات دو حصوں میں تقسیم کئے گئے تھے جن میں خاص شعراء کے کلام پر تنقید کی گئی ہے مثلاً مومن ظفر، غالب، مصحفی، انیس، امیر، جوش، اصغر وغیرہ وغیرہ۔ دوسرے حصہ میں عام ادبی و انتقادی مباحث ہیں جنکا تعلق شعر و ادب کی تاریخ سے ہے۔ حصہ اول ختم ہو گیا حصہ دوم معہ علاوہ محصول

مذہب

حضرت نیاز کا وہ معرکۃ الآرا مقالہ جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ مذہب کی حقیقت کیا ہے اور دنیا میں کیونکر رائج ہوا۔ اسکے مطالعہ کے بعد اس کے مطالعہ کے بعد انسان خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ مذہب کی پابندی کیا معنی رکھتی ہے

قیمت ایک روپیہ

علاوہ محصول

نگار کے خاص نمبر

جنوری، فروری ۱۹۵۰ء

نگار ۲۸ سالہ ادبی و تنقیدی خدمات کا نچوڑ جس میں ۱۹۲۲ء سے لیکر ۱۹۵۰ء تک کے تمام تنقیدی رجحانات اور انتقادی نمونوں کو واضح کیا گیا ہے۔ اس میں بعض ایسے اکابر شعراء کا تذکرہ و انتخاب کلام بھی شامل ہے جن کے حالات عام طور پر معلوم نہیں ہیں اور جن کا کلام نایاب ہے۔ اس میں جدید تنقیدی میلانات اور قدیم نقادوں کے مقالات بھی شامل ہیں۔

قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

جنوری ۱۹۴۲ء

اس نمبر میں ریاض خیرآبادی مرحوم کے کلام پر ملک کے متعدد مشاہیر نے نقد و تبصرہ کر کے بتایا ہے کہ ریاض کی شاعری کیا تھی۔

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

فروری، مارچ ۱۹۴۶ء

جو فن انتقاد پر ملک کے بہترین اہل قلم اور ارباب فکر کے مضامین پر مشتمل ہے۔

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ علاوہ محصول

جنوری ۱۹۴۷ء

اس سالنامہ کا نام ماجد لین نمبر ہے جسمیں ایک جینیل فرانسیسی ادیب کی ایک شاہکار ٹریجڈی کو اردو میں منتقل کیا گیا ہے۔ ادب اور جذبات نگاری کے لحاظ سے یہ ناول اپنا نظیر نہیں رکھتا۔

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ علاوہ محصول

جنوری، فروری ۱۹۴۸ء

(پاکستان نمبر) نگار کا جوبلی نمبر جسمیں دنیا کے سامنے اسلام کی عظمت رفتہ اور عزائم اسلام کے بلند حقایق کو پیش کیا گیا ہے تاکہ مسلمان اپنے مستقبل کی تعمیر کے وقت اسلام کے دو رین اور ان کارناموں کو بھولے جنپر مسلم حکومت کی بنیاد قائم ہوئی تھی۔ قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

جنوری فروری ۱۹۴۹ء

نگار کا افسانہ نمبر جسمیں تقریباً تیس افسانے بہترین اہل قلم کے شایع کیے گئے ہیں۔ اس سالنامہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اسکے مطالعہ سے بآسانی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ افسانہ نگاری کے کتنے اصول ہیں اور ہر اسکول کا معیاری افسانہ کیسا ہونا چاہیے۔ قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری ۱۹۵۱ء

اس سالنامے کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصہ میں "مارس ہندوس" کی کی مشہور عالم کتاب "ایک مستقبل کی تلاش" کا ترجمہ و اقتباس ہے جس میں، اس نے ایران، مصر، عرب، عراق اور فلسطین وغیرہ ممالک اسلامی کی سیاحت کے بعد وہاں کی موجودہ اقتصادی زبوں حالی اور ان کے اسباب پر روشنی ڈالی گئی ہے اور اسی کے ساتھ یہ بھی بتایا ہے کہ انکا مستقبل کتنا روشن ہے اگر وہ ترقی کے صحیح راستہ کو جان لیں۔

سالنامہ کا دوسرا حصہ ایڈیٹر نگار کے قلم کا ہے جسمیں پہلی جنگ کے بعد مسلم حکومتوں کے انقلاب کی تاریخ اور اسکے اسباب کو ظاہر کیا گیا ہے قیمت دو روپیہ

نگار کی قیمت

سالانہ ہندوستان و پاکستان کے اندر چھ روپیہ ششماہی جاری نہیں ہو سکتا۔ سالانہ بیرون ہند۔ بارہ روپیہ

(نوٹ) رسالہ ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ تک شایع ہوتا ہے اور اسکے بعد اطلاع آنے پر وہ بارہ روانہ ہو سکتا ہے ورنہ پھر کسی طرح نہیں مل سکتا۔ "مینجر"

جواب کیلیے ٹکٹ بھیجنا ضروری ہے اور خط و کتابت میں اگر نمبر خریداری نہ دیا گیا تو تکمیل دشوار ہے

اجرت اشتہار اور کمیشن وغیرہ کی تفصیلات "مینجر "نگار" سے طلب کیجیے